انسپکٹر جمشید، شوکی برادرز، فاروق محمود فرزانہ
کا کارنامہ

چاٹ کا چکر

اشتیاق احمد

صفحات 167

From:-

Sana Rafique

To - Marriam and Mahnesh

Must

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۳۸

چاٹ کا چکر

اشتیاق احمد

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

نام ناول	چاٹ کا چکر
بار اوّل	یکم فروری ۱۹۸۶ء
طابع	اشتیاق احمد
مطبع	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
خوش نویس	محمد سعید نامدار
سرورق	محمد جاوید چغتائی
طباعت سرورق	فوراے پرنٹرز، لاہور
قیمت	۶/- روپے
سالانہ قیمت	۳۰۰/- روپے

اشتیاق پبلی کیشنز

راجپوت مارکیٹ ● اُردو بازار، لاہور

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ابوبکر رضی اللہ عنہ انبیا کے سوا تمام انسانوں سے بہتر ہیں۔

(کنز، صفحہ ۱۳۷، جلد ۶)

*

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

● یہ وقت نماز کا تو نہیں۔ ● آپ اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
● کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں۔ ● آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا۔ ● آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں۔ پھر ناول پڑھیں۔

شکریہ! مخلص: اشتیاق احمد

دو باتیں

السلام علیکم —

زیادہ تر خطوط میں اب یہ خیال ظاہر کیا جانے لگا ہے کہ آپ کی دو باتیں اب خشک خشک آ رہی ہیں۔ ان میں ہنسانے مسکرانے والی کوئی بات نہیں ہوتی — کیا آپ دو باتیں لکھنا بھول گئے ہیں —

حیرت کی بات ہے کہ ناول کی کہانی سے زیادہ دو باتیں کی بات کی جاتی ہے، بلکہ یہ حیرت کی ہی نہیں میرے لیے خوشی کی بات بھی ہے کہ میری لکھی ہوئی دو باتیں آپ کے نزدیک اس قدر اہمیت حاصل کر گئی ہیں — لیجیے — مسئلہ تو حل ہو گیا — جب ایک چیز اہمیت حاصل کر جائے تو پھر اس میں ہنسنا ہنسانا کہاں رہ جاتا ہے — خیر، اس کے باوجود میں کوشش کروں گا کہ دو باتیں کی حد تک ایک بالکل نیا جنم لوں — تاکہ پہلے جیسی دو باتیں آپ کے لیے تحریر کر سکوں — لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان نیا جنم لے ہی نہیں سکتا، اسے تو اپنے پہلے جنم سے ہی کام چلانا پڑتا ہے — ہاں یہ ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا میری جگہ لے لے اور بالکل اس جیسی دو باتیں لکھنا شروع کر دے، جیسی پہلے کبھی میں لکھتا رہا ہوں، اس کے لیے بھی آپ کو صبر کا گھونٹ بھرنا پڑے گا — انتظار کرنا پڑے گا — انتظار — جیسے ہماری قوم — کسی محمد بن قاسم یا طارق بن زیاد کا انتظار کر رہی ہے — کر رہی ہے نا — کاش آپ میں سے ہی کوئی پیدا ہو جائے —

اشتیاق

خُفیہ کام

گھنٹی کی آواز سُنتے ہی اُن کے چہرے کِھل اُٹھے:
"بھئی واہ! مزا آگیا۔ صبح ہی صبح پروفیسر انکل"۔ فاروق چہکا۔

"دماغ تو نہیں چل گیا۔ اس وقت شام کے پونے پانچ بجے ہیں۔ ابّا جان کے آنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں"۔ محمود نے اسے گھورا۔

"اتنی سی بات میں بھی کوئی دماغ چلا کرتا ہے، جاؤ۔ اچھے بچّوں کی طرح دروازہ کھول دو"۔ فاروق مسکرایا۔

"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تمھارے ہاتھوں کو تو مہندی لگی ہوئی ہے"۔ فرزانہ نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں، دروازہ کھولنا محمود کا کام ہے۔ میرا نہیں، دوسرے یہ کہ مہندی لڑکیاں لگایا کرتی ہیں، لڑکے نہیں، تمھیں اتنا بھی معلوم نہیں"۔ اس نے گنگنانے کے انداز میں کہا۔

"اور مَیں یہ کہتی ہوں کہ تُمھیں تو اتنا بھی نہیں پتا کہ جب
کوئی دروازے پر دستک دے تو فوراً دروازہ کھول دینا
چاہیے۔ یہ کیا کہ کوئی دروازے پر کھڑا انتظار کر رہا ہے اور
تم باتیں بگھار رہے ہو۔" بیگم جمشید نے باورچی خانے سے باہر
نکلتے ہوئے تلملا کر کہا۔

"اور کیا۔ بگھارنے کے لیے اور تھوڑی چیزیں ہیں۔ اور پھر بگھارنے
کا کام تو ہمیں یوں بھی امّی جان پر چھوڑ دینا چاہیے۔" فرزانہ نے
مُسکرا کر کہا۔

"خیر خیر۔ مَیں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔ واپسی پر تم سے
سمجھوں گا۔" محمود نے پاؤں پٹخے۔

"کیا سمجھو گے۔ اس میں سمجھنے سمجھانے والی بات کہاں
سے نکل آئی۔ اور پھر پروفیسر انکل کی موجودگی میں تم خاک کچھ
سمجھاؤ گے۔" فارُوق نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گئی۔ تم دروازہ کھولنے کے لیے نہیں جاؤ گے۔
یہ کام آج مجھے کرنا ہو گا۔ چلو فرزانہ تم ذرا باورچی خانے
میں دُودھ کا دھیان رکھو۔ اُبل نہ جائے۔"

"لیکن امّی جان۔ آپ نے دُودھ اُبلنے کے لیے ہی تو چولھے
پر رکھا ہے۔" فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں! بے شک! کہنے کا مطلب یہ کہ اُبل کر چولھے

پر نہ آ گرے۔"

"تو پھر آپ ایسا کریں کہ باورچی خانے میں ہی موجود رہیں
مَیں دروازہ کھول آتی ہوں۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

"آئی بڑی دروازہ کھولنے والی۔" محمود نے بھنا کر کہا اور
دروازے کی طرف لپکا۔

"اگر پہلے ہی یہ جُملہ کہہ کر دروازے کی طرف چلے جاتے
تو کیا حرج تھا۔" فارُوق نے بُرا سا مُنہ بنایا۔

"اور اگر تم ذرا مُنہ بند رکھ لیتے تو کیا نقصان تھا۔" محمود
نے چلتے چلتے پلٹ کر کہا۔

"معلوم ہو گیا۔ آج پروفیسر صاحب انتظار کرتے کرتے
واپس چلے جائیں گے۔"

"ارے باپ رے۔" محمود نے دوڑ لگا دی۔ اور پھر ایک
جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

دُوسرے ہی لمحے پروفیسر صاحب کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی
دی:

"خیر تو ہے بھئی۔"

"کیوں انکل۔ کیا آپ کو ہمارے بارے میں کیا کوئی ایسی
ویسی خبر ملی تھی۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"ایسی ویسی خبر اس سے زیادہ کیا ہو گی کہ تم نے

دروازہ پورے ایک منٹ کے بعد کھولا۔ اس سے تو میں یہی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ خیریت نہیں ہے۔ بے چاری کہیں اِدھر اُدھر چلی گئی ہو گی۔" پروفیسر صاحب نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"اوہ معاف کیجیے گا انکل۔ ہم نے واقعی آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔ اپنی باتوں میں اُلجھ گئے اور اس طرح ایک منٹ ضائع کر دیا۔ آیندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی، معاف کر دیجیے۔"

"اس وقت معاف کر دینے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔" انھوں نے بے چارگی کے عالم میں کندھے اچکائے۔

"جی کیا مطلب؟" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

اس وقت تک وُہ دروازہ اندر سے بند کر چکا تھا۔ اور دونوں صحن کی طرف بڑھ چلے تھے۔

"مجھے۔ م۔ مجھے۔ تم لوگوں سے ایک کام ہے۔" وُہ ہکلائے۔

"اس سے اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کو ہم سے کوئی کام ہے۔ لیکن انکل۔ اس میں ہکلانے کی کون سی بات ہے۔ آپ تو اس طرح ہکلا رہے ہیں۔ جیسے لوگ قرض مانگتے ہوئے ہکلاتے ہیں۔ قرض مانگنا واقعی ایک بہت مشکل بلکہ ٹیڑھا کام ہے اور ایسے میں ہکلانا کچھ بڑی بات بھی نہیں، اللہ کرے۔ کک۔ کہیں آپ بھی تو" فاروق کہتے

کہتے رُک گیا۔

"ارے نہیں۔ تم غلط سمجھے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میری مالی حالت بہت اچھی ہے، اللہ کی مہربانی سے۔ مجھے تو تم لوگوں سے ایک اور ہی کام ہے۔ بہت ضروری اور خفیہ کام۔"

"خفیہ کام۔" محمود نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"آپ کا مطلب ہے۔ کام جاسوسی نوعیت کا ہے۔" فرزانہ بول پڑی۔

"بلکہ سنسنی خیز قسم کا ہے۔" فارُوق نے فوراً کہا۔

"نہیں۔ تمھارا یہ خیال بھی غلط ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، یہ دن تمھارے لیے غلط اندازوں کا دن ہے۔" پروفیسر بولے۔

"یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں انکل؟" محمود ہکلایا۔

"ہاں! میں ٹھیک کر رہا ہوں۔ دیکھو، انسپکٹر جمشید کے آنے میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ جلدی سے میرا کام کر دو۔"

"تو پھر آپ بھی تو جلدی سے فرما دیں نا۔ کام کیا ہے؟" فاروق بولا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ تم ذرا جلدی سے مجھے روفی چاٹ کی دو پلیٹیں لا دو۔"

"جی۔ کیا فرمایا۔ روفی چاٹ کی دو پلیٹیں۔ یہ آپ کیا کہ رہے ہیں انکل۔ ہم کچھ نہیں سمجھے۔" محمود دھک سے رہ گیا۔

"یار تم روفی چاٹ کا مطلب نہیں سمجھے۔" پروفیسر داؤد بھنّا اُٹھے۔

"وُہ تو ہم سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہی روفی مارکیٹ ہے۔ اس مارکیٹ میں عبدالرؤف چاٹ والا بیٹھتا ہے۔ اس کی چاٹ روفی چاٹ کے نام سے مشہور ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اس چاٹ کا کیا کریں گے؟"

"کھاؤں گا بھئی۔ اور کیا کروں گا۔ سُنو یار۔ تم یُوں نہیں سمجھو گے۔ ہم ایک ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں پُرتکلف کھانے اور پینے کی چیزیں ہی ہمیں ملتی ہیں۔ عام چیزیں کھانے کو ہم ترس جاتے ہیں۔ بہُت دِنوں سے فروٹ چاٹ کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ تم جانتے ہی ہو گے، روفی چاٹ جیسی چاٹ گھر میں بھی تیار نہیں ہو سکتی۔ لہذا میں نے یہاں آنے کا پروگرام بنایا، مَیں چاہتا ہُوں، تم فوراً مجھے چاٹ لادو، ایسا نہ ہو کر جمشید یہاں آ جائے۔"

"لیکن انکل۔ اگر وُہ آ گئے تو بھی کیا ہے؟"

"نہیں بھئی۔ مَیں فروٹ چاٹ سب سے چھپ کر کھاؤں گا، ورنہ جمشید کیا سوچے گا۔"

"بہُت بہتر۔ ہم ابھی چاٹ حاضر کر دیتے ہیں۔ آؤ فارُوق۔" محمود نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

دونوں نے باورچی خانے سے برتن لیا اور گھر سے نکل گئے۔ روفی مارکیٹ زیادہ دُور نہیں تھی۔ وُہ چاٹ کی دکان پر پہنچے اور پریشان ہو گئے۔ وہاں بہت بھیڑ تھی اور ان کی باری آنے میں پندرہ بیس منٹ لگ سکتے تھے۔ دونوں نے پریشان ہو کر ایک دُوسرے کی طرف دیکھا:

"اب کیا کریں؟" محمود نے دبی آواز میں کہا۔

"ہمیں فرزانہ کو ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔" فارُوق بولا۔

"وُہ کس لیے؟" محمود نے اسے گھورا۔

"ترکیب پُوچھ لیتے اس سے کہ اب کیا کریں۔ ویسے فرزانہ بازار میں آتی کب ہے؟"

"ہوں! اس کا مطلب ہے، ہمیں خود ہی ترکیب معلوم کرنا ہو گی۔"

"مُشکل یہ ہے کہ چاٹ والا ہمیں بالکل نہیں جانتا۔ ہم کب چاٹ کھانے آئے ہیں۔ بھئی یُوں کام نہیں چلے گا۔ عقل کو ہاتھ مارو۔" فارُوق نے پریشان آواز میں کہا۔

"تمہیں کیا ہے۔ تم نہیں ہاتھ مار سکتے عقل کو؟" محمود تلملا اُٹھا۔

"بہت اچھا۔ لو۔ میری ترکیب ملاحظہ کرو۔" فارُوق نے کہا اور پھر ایک زور دار چیخ ماری:

"ارے سانپ۔ کالا ناگ۔ اندر گھُس گیا۔ وُہ رہا۔ وُہ گیا"

اس کی چیخ نے ہل چل مچا دی۔ دکان کے اندر جو لوگ
بیٹھے چاٹ کھا رہے تھے، پلیٹیں چھوڑ چھاڑ کر باہر کی طرف
دوڑے۔ برتنوں میں جو لوگ چاٹ لینے آئے تھے۔ وہ بھی
دکان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور تو اور عبدالرؤف چاٹ
والے نے اپنی گدی پر سے نیچے چھلانگ لگا دی اور چیختا ہوا
دور چلا گیا۔ چند سیکنڈ میں ہی میدان صاف تھا۔

"محمود۔ اس سے بہتر موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ چاٹ کی
تیار شدہ پلیٹیں ٹفن میں الٹ لو۔ چاٹ کی قیمت ایک طرف رکھ
دو اور نکل چلو۔"

"لیکن۔ یہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے۔" محمود نے الجھن کے
عالم میں کہا۔

"تو ہم ان کے ہاتھ کیوں آنے لگے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"اچھا۔ اب یہی کرنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر محمود تختے پر چڑھ گیا۔ جہاں دکان دار بیٹھا تھا،
کئی پلیٹیں تیار شدہ رکھی تھیں، اس نے جلدی جلدی تین چار
پلیٹیں ٹفن میں الٹ لیں، پچاس روپے کا نوٹ وہاں رکھا اور
ٹفن بند کرتا ہوا نیچے اتر آیا، اس وقت تک فاروق محمود
کو اوٹ میں لینے کی کوشش کرتا رہا تھا اور اس کا انداز ایسا
تھا جیسے سانپ کو دیکھ رہا ہو۔ اب جو دونوں بھاگے تو

کوئی چلا اٹھا:

"ارے۔ یہ تو چاٹ لے کر بھاگ رہے ہیں۔ ہائیں۔ تو
یہ چاٹ چور ہیں۔ پکڑو انھیں۔"

"نہیں! ہم نے چاٹ کی قیمت رکھ دی ہے۔ ہمیں
دراصل بہت جلدی تھی۔ معاف کیجیے گا۔" فاروق نے چلا کر
کہا اور دونوں کنی کترا کر بھاگے۔ چند آدمی ان کے پیچھے
دوڑے، لیکن پھر جلد ہی انھوں نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا۔
اور وہ گھر میں داخل ہو گئے۔ پروفیسر داؤد بے چینی سے
ان کا انتظار کر رہے تھے:

"ارے۔ بہت جلدی آ گئے۔ میں نے تو سنا ہے، وہاں
بہت رش ہوتا ہے۔" وہ خوش ہو کر بولے۔

"جی ہاں انکل۔ رش تو واقعی بہت تھا۔ ہم نے ترکیب نمبر
سولہ اختیار کر ڈالی۔"

"کیا مطلب۔ ترکیب نمبر سولہ۔" فرزانہ چونکی۔

"ہاں! جلدی سے پلیٹیں لے آؤ۔ یہ وقت ترکیب کی تفصیل
بتانے کا نہیں ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"پلیٹیں۔ پلیٹوں کی کیا ضرورت ہے بھئی۔"

"جی انکل۔ تو کیا آپ چاٹ گھر جا کر کھائیں گے؟"

"نن۔ نہیں تو۔ تم نے یہ اندازہ میری کس بات سے

یا" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"آپ نے ہی تو کہا ہے۔ پلیٹوں کی کیا ضرورت ہے"

"تو پھر۔ ٹھیک تو کہا ہے۔ بھئی چاٹ صرف میں کھاؤں گا۔ تم لوگ نہیں"

"جی کیا مطلب۔ ہم کیوں نہیں کھائیں گے"

"تگ۔ کیا اتنی چاٹ ہے کہ تم بھی کھا سکو"

"جی ہاں! ہم بہت کافی چاٹ لائے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں" فاروق نے کہا۔

"اوہ! تب تو ٹھیک ہے۔ پھر تو لے آؤ پلیٹیں" وہ خوش ہو کر بولے۔

فرزانہ جلدی سے باورچی خانے کی طرف گئی اور پلیٹیں لے آئی۔ پھر سب نے اپنی اپنی پلیٹ میں چاٹ ڈالی۔ اور ابھی پہلے لقمے منہ کی طرف گئے ہی تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ پروفیسر داؤد زور سے اچھلے۔ ادھر محمود، فاروق اور فرزانہ کی آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔

"میں اپنے بیٹے سے آپ کو ملانا چاہتا ہوں"

انسپکٹر جمشید نے ادھیڑ عمر آدمی کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور الجھن کے آثار تھے:

"کہاں ہے آپ کا بیٹا؟" وہ بولے۔

"گھر۔ وہ یہاں نہیں آ سکتا، آپ کو وہاں جانا ہوگا"

"بات کیا ہے؟"

"افسوس! مجھے نہیں معلوم۔ کیا بات ہے" اس نے دبی آواز میں کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"میرے بیٹے کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے، تمام ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں"

"تب پھر۔ آپ میرے پاس کیوں آئے ہیں۔ میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ آپ ڈاکٹر نہیں ہیں، لیکن آپ سراغ رسانی کے ڈاکٹر تو ہیں نا"

"میں سمجھا نہیں۔ ابھی آپ ڈاکٹروں کا ذکر کر رہے تھے۔ پھر اس معاملے میں جاسوسی کہاں سے نکل آئی"

"بات اس طرح آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میرے ساتھ چلیے۔ ساری بات فوراً سمجھ جائیں گے"

"اچھی بات ہے۔ میں چلتا ہوں۔ لیکن۔ یہ بات نوٹ کر

لیں۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔"

"یہ بات تو میں پہلے ہی جانتا ہوں۔"

"شکریہ۔ آئیے چلیں۔ ارے ہاں۔ آپ نے اپنا نام نہیں بتایا، جانا کہاں ہے؟"

"میں سرور راہی ہوں۔ غالب کارنر پر رہتا ہوں۔"

"اوہو۔ مشہور و معروف شاعر۔" وہ چونکے۔

"جی بس۔ جو آپ سمجھ لیں۔" اس نے عاجزانہ انداز میں کہا۔

"کیا آپ کا بیٹا کسی مجرمانہ کام میں اُلجھ گیا ہے؟"

"اگر اس بات کا امکان ہوتا تو میں پہلے ڈاکٹر حضرات کے چکر کیوں لگاتا۔"

"اس کا مطلب ہے۔ وہ بیمار ضرور ہے اور اس کی بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔" وہ بولے۔

"جی۔ جی ہاں۔ بالکل یہ ہی بات ہے۔"

"اور آپ میرے ذریعے اس کی بیماری کا سُراغ لگانا چاہتے ہیں۔"

"جی ہاں! یہی بات ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا یہ بات عجیب و غریب نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"حد درجے، لیکن میں کیا کروں۔ کس کے پاس جاؤں۔" اس نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"جب ڈاکٹروں کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں، دوائیں کام کرنا بند کر دیتی ہیں تو لوگ بزرگوں کا رُخ کرتے ہیں، ان سے دُعائیں کراتے ہیں اور آپ میرے پاس چلے آئے۔"

"مجھے یہی مناسب معلوم ہوا تھا، میں یہاں آنے پر مجبور ہو گیا۔ اُمید ہے، معاف فرمائیں گے۔"

"خیر۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

آخر وہ اس کے ساتھ باہر نکلے۔ سرور راہی اپنی شان دار کار میں آیا تھا۔ وہ مشہور شاعر ہی نہیں۔ بہت بڑا سرمایہ دار بھی تھا۔ وہ اس کی کار میں بیٹھ کر غالب کارنر پہنچے۔ انسپکٹر جمشید اس کی عالی شان کوٹھی دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ جوں ہی کار گیٹ میں داخل ہوئی۔ ملازمین کی ایک فوج کار کی طرف لپکی۔ اور آگے بڑھ کر کار کے دروازے کھول دیے۔ وہ نیچے اُترے اور ساتھ ساتھ چلتے اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر جمشید نے ملازمین کے چہرے بجھے بجھے محسوس کیے۔ پورے گھر پر سوگ سا طاری تھا۔ آخر وہ ایک بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کے فرش پر موٹا قالین بچھا تھا۔ ایک دیوار کے ساتھ مسہری بچھی تھی۔ مسہری کے ساتھ تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ مسہری پر ایک نوجوان لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے

دیکھ رہا تھا۔

"ارجو۔ دیکھو کون صاحب آئے ہیں؟" سرور راہی نے پیار بھرے انداز میں کہا۔

لیکن نوجوان نے جیسے اس کی آواز سُنی ہی نہیں۔

"یہی ہے میرا بیٹا انسپکٹر صاحب۔ اس کا نام ارجمند ہے، پیار سے ارجو کہتے ہیں ہم۔ پندرہ دن سے اس کی بس یہی حالت ہے۔ نہ کسی سے کوئی بات کرتا ہے۔ نہ اِدھر اُدھر کسی کی طرف دیکھتا ہے۔ بس ہر وقت چھت کی طرف دیکھتا رہتا ہے، کھانے کے اوقات میں کھانا پاس رکھ دیتے ہیں تو اُٹھ کر کھا لیتا ہے۔ اگر نہ رکھیں تو مانگتا نہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، اسے کوئی بیماری نہیں۔ بالکل ٹھیک ہے، لیکن اگر یہ بالکل ٹھیک ہے تو بات کیوں نہیں کرتا۔ زندگی کی دلچسپیوں میں حصّہ کیوں نہیں لیتا۔ پندرہ دن پہلے تو ایسا نہیں تھا۔" یہاں تک کہ کر سرور راہی خاموش ہو گیا۔

"کسی سے اُلجھ تو نہیں پڑتے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

انسپکٹر جمشید اس سے نزدیک ہو گئے اور پُرسکون آواز میں بولے:

"مسٹر ارجمند۔ میں آپ سے مخاطب ہوں۔ مہربانی فرما کر

میری طرف دیکھیے اور میری باتوں کے جواب دیجیے۔" یہ کہ کر وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن ارجمند نے تو جیسے سُنا ہی نہیں۔

اب انھوں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور بازو کی مدد سے اسے اپنی طرف گھما دیا۔ وہ ان کی طرف گھوم گیا۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی نہ ان کی طرف سے گردن گھمائی۔ نہ چہرے پر کسی قسم کے آثار پیدا ہوئے۔ ہاتھ چھوڑا تو وہ بے جان سا مسہری پر گر گیا:

"پندرہ دن پہلے یہ بالکل ٹھیک تھے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! بالکل۔"

"ٹھیک۔ پندرہ دن پہلے ان کی یہ حالت کس وقت محسوس کی گئی۔ مجھے اس لمحے کے بارے میں بتائیں۔ جب ان میں تبدیلی محسوس کی گئی۔"

"اس روز یہ صبح سویرے معمول کے مطابق کالج گیا تھا۔ کالج سے لوٹا تو حالت عام نہیں تھی۔ نہ کسی سے کوئی بات کی۔ نہ کھانا مانگا۔ آتے ہی نڈھال سا بستر پر لیٹ گیا۔ اس کی ماں نے خیال کیا۔ بیٹے کی طبیعت خراب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر کو فون کر دیا۔ ڈاکٹر آیا۔ اور سکون کا انجکشن لگا کر چلا گیا، ٹیکا لگنے کے بعد یہ سو گیا۔ دوسرے دن جاگا تو یہی حالت

تھی جو ہم اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اس کے کالج
بھی فون کیا۔ تاکہ معلوم کر سکوں۔ وہاں تو کوئی واقعہ نہیں
ہو گیا۔ لیکن کالج سے معلوم ہوا۔ یہ تو کالج پہنچا ہی نہیں تھا،
گویا کالج کا وقت اس نے کہیں اور گزارا تھا۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں! لہٰذا میں کیا بتا سکتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا
ہوا ہے۔"

"اس کا کالج کا کوئی قریبی دوست تو ہو گا۔"

"جی ہاں۔ نواز جان اس کا گہرا دوست ہے۔"

"آپ نے اس سے بات کی۔"

"وہ اسی روز سے گم ہے۔"

"کیا مطلب۔ گم ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! وہ بھی اس روز کالج نہیں پہنچا تھا۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے جیسے یہ دونوں کہیں اور گئے تھے۔ وہاں سے یہ تو
واپس آ گیا، لیکن نواز جان واپس نہیں آیا۔ اب یہ ہوش
میں ہو تو کچھ بتائے بھی۔"

"تب تو معاملہ حد درجے پُر اسرار ہے۔ نواز جان
کہاں رہتا ہے؟"

"یہاں سے سو میٹر دور۔ کوٹھی کا نمبر ۱۱۵ ہے۔"

"شکریہ۔ میں پہلے اس کے گھر والوں سے ملنا پسند کروں گا۔"

"چلیے۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں۔" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ آپ یہیں ٹھہریے۔ صرف میں جاؤں گا۔"

"لیکن آپ جائیں گے کیسے؟"

"فکر نہ کریں، مختصر سا تو فاصلہ ہے۔" وہ بولے۔

"میری کار لے جائیں۔" اس نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بولے۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتے
باہر نکل آئے۔

پانچ منٹ بعد انھوں نے ۱۱۵ نمبر کی کوٹھی کے دروازے
پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت کی
صورت نظر آئی، پھر وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گئی اور دروازے
کی اوٹ میں ہو گئی:

"اوہ۔ مم۔ میں سمجھی تھی۔ میرا بیٹا آ گیا۔"

"مجھے افسوس ہے۔ میں نے آپ کو پریشان کیا۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

"آپ۔ آپ کون ہیں؟"

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔ میں آپ کے بیٹے کو تلاش کرنے
کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

"اوہ۔ ایک منٹ ٹھہریے۔" عورت نے کہا اور اس کے جاتے

قدموں کی آواز سنائی دی۔

پھر جلد ہی ایک ادھیڑ عمر آدمی دکھائی دیا۔ اس کے چہرے سے بھی غم جھلک رہا تھا:

"تشریف لائیے جناب! میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا کہ آپ اس معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"میں آپ کے بیٹے کو تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گا، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ آپ میری کچھ مدد کریں۔"

"مم۔ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟"

"اس بارے میں جو کچھ جانتے ہیں، بتا دیں۔ نواز جان اور ارجمند ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان کا مشغلہ کیا تھا، دونوں مل کر کس طرح وقت گزارتے تھے۔"

"ان کا بس زیادہ تو ایک ہی شوق تھا۔ اور وہ یہ کہ روزانہ روفی چاٹ کھایا کرتے تھے۔"

"روفی چاٹ۔ کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

یہ کیا ہے

"لیجیے انکل۔ اسے کہتے ہیں۔ چپڑی اور دو دو۔ ہم ابا جان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، آ گئے انکل خان رحمان۔" فاروق نے چہکتی آواز میں کہا۔

"بالکل غلط۔ اسے چپڑی اور دو دو نہیں کہتے۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر۔ اسے کیا کہتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ کہتے ہوں گے کچھ۔ مجھے اس سے کیا۔" فاروق بولا۔

"جب کچھ پتا ہی نہیں تو پھر خاموش رہو۔ ارے محمود۔ تم اب تک دروازہ کھولنے نہیں گئے۔" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

"میں تم دونوں کی نوک جھونک سننے لگ گیا تھا۔"

"اور اب باتیں کرنے میں لگ گئے ہو۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"مطلب یہ کہ باہر انکل خان رحمان کھڑے ہیں۔ اور تم۔۔" فارُوق کہتے کہتے رُک گیا۔

"م۔ میں پروفیسر انکل کی وجہ سے رُکا ہوں۔" محمود نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ کیا پروفیسر انکل یہ بات پسند کریں گے کہ انکل خان رحمان انھیں چاٹ کھاتے دیکھیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ خان رحمان تو خُود بھی چاٹ کھانا پسند کرے گا۔" پروفیسر داؤد جلدی سے بولے۔

"بہت بہتر۔ پھر میں چلا۔"

محمود نے کہا اور جا کر دروازہ کھول دیا، ساتھ ہی ان سب کے کانوں سے خان رحمان کی آواز ٹکرائی:

"میں اندر نہیں آؤں گا۔"

"وُہ کیوں انکل؟" محمود نے گھبرا کر کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ۔ دروازہ کھولنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟"

"جی۔ پروفیسر انکل کی وجہ سے۔"

"کیا مطلب۔ کیا پروفیسر صاحب بھی اندر مُوجود ہیں؟"

"ج۔ جی ہاں۔" اس نے کہا۔

"اوہ۔ یہ تو بہت بُرا ہوا۔" خان رحمان بڑبڑائے۔

"جی کیا مطلب۔ بُرا ہوا۔ وُہ کیسے۔ پروفیسر انکل کی مُوجودگی سے بُرا کیسے ہو سکتا ہے انکل؟"

"میں تنہائی میں آنے کے چکر میں تھا۔" وُہ بولے۔

"آپ آئیے تو سہی۔ تنہائی بھی آپ کو مل جائے گی۔" محمود نے کہا۔

"ہاں! آنا تو خیر ہو گا ہی۔ ورنہ پروفیسر صاحب بُرا مان جائیں گے۔"

"نہیں خان رحمان۔ مَیں بُرا نہیں مانوں گا۔ تم بے شک اندر نہ آؤ۔" اندر سے پروفیسر داؤد بولے۔

"ہائیں۔ پروفیسر صاحب۔ یہ آپ کیا کہ رہے ہیں۔ یعنی اگر مَیں آپ سے ملے بغیر چلا گیا تو آپ بُرا نہیں مانیں گے۔"

"ہاں ہاں۔ نہیں مانوں گا۔" پروفیسر داؤد پُرزور آواز میں بولے۔

"اس کے باوجود میں اب اندر آکر رہوں گا۔" انھوں نے کہا اور اندر داخل ہو گئے، پھر جُوں ہی وُہ صحن میں پہنچے۔ قدرے حیران ہو کر بولے:

"یہ۔ یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"دیکھ نہیں رہے۔ چاٹ کھائی جا رہی ہے۔" پروفیسر داؤد بچّوں کی طرح خوش ہو کر بولے۔

"چ چ - چاٹ" خان رحمان ہکلائے۔

"جی ہاں انکل - چاٹ - اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"
فاروق مسکرایا۔

"م - میں ڈر کب رہا ہوں" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

"اگر آپ ڈر نہیں رہے تو چاٹ کا لفظ کہتے ہوئے ہکلائے کیوں تھے؟" محمود بولا۔

"وہ - وہ تو میں کسی اور وجہ سے ہکلایا تھا۔"

"خیر خیر - ہکلائے ہوں گے، ہمیں کیا - یہاں ہکلانے پر کوئی پابندی نہیں ہے - آؤ تم بھی بیٹھو اور چاٹ میں شریک ہو جاؤ۔"

"ش ش - شریک تو میں ہو جاؤں گا، لیکن - کاش۔"

"کاش کیا - انکل - یہاں کاش کہاں سے ٹپک پڑا۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

"م - میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کاش - آپ لوگ روفی چاٹ کھا رہے ہوتے۔"

"جی - کیا مطلب؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا - آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں:

"آپ نے کیا کہا انکل - روفی چاٹ کھاتے۔"

"ہاں؛ روفی چاٹ۔"

"آپ کو یہ سن کر حیرت بھی ہو گی اور خوشی بھی - کہ یہ روفی چاٹ ہی ہے۔"

"ارے کمال ہے۔" خان رحمان کے منہ سے نکلا۔

"جی - اس میں کمال کی کیا بات ہے؟"

"مطلب یہ - بھئی - کہ میں دراصل۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"آج تو آپ اٹکنے اور ہکلانے کا ریکارڈ توڑ رہے ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں - شاید تم ٹھیک کہتے ہو - خیر - میں جملہ مکمل کیے دیتا ہوں - بات دراصل یہ ہے کہ میں آج یہاں روفی چاٹ کھانے کے ارادے سے ہی آیا تھا - اب یہ کس قدر زبردست اور شان دار اتفاق ہے کہ آپ لوگ پہلے ہی روفی چاٹ کھانے میں مصروف ہیں۔"

"مصروف تو خیر نہیں انکل - ابھی تو ہم شروع کرنے ہی والے تھے کہ آپ کی گھنٹی سنائی دے گئی تھی - اس طرح ہمارے ہاتھ درمیان میں ہی رہ گئے۔"

"اوہ - تب - تب تو ٹھیک ہے - میں بھی شریک ہو جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر خان رحمان بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور ایک خالی پلیٹ اٹھا لی۔

"لیکن انکل - یہ کس قدر حیرت انگیز اتفاق ہے کہ آج ہی

آپ روفی چاٹ کھانے کے ارادے سے یہاں آئے اور آج ہی
پروفیسر انکل۔"

"کیا مطلب۔ کیا پروفیسر صاحب کے لیے یہ چاٹ تم لوگ
اپنی مرضی سے نہیں لائے۔" خان رحمان کے لہجے میں بلا کی حیرت
در آئی۔

"جی نہیں! پروفیسر انکل نے بھی آ کر خاص طور پر روفی چاٹ
کی فرمائش کی تھی۔"

"ہائیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟" خان رحمان نے آنکھیں نکالیں۔

"بات صرف اتنی سی ہوئی کہ میں بہت دنوں سے کوئی ایسی
چیز کھانے کے لیے بے چینی محسوس کر رہا تھا۔"

"اور۔ اور۔ میں بھی۔"

"حیرت انگیز۔ انتہائی حیرت انگیز اتفاق" فرزانہ بڑبڑائی۔
اس کی آنکھوں سے اُلجھن جھانکنے لگی۔

"خیر تو ہے۔ تم پریشان ہوگئیں۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ حیرت انگیز اتفاق بلاوجہ نہیں ہو سکتا۔" اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟" خان رحمان اور پروفیسر داؤد ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ کہ اس کی ضرور کوئی خاص وجہ ہے۔ اور وہ وجہ
آپ لوگ ہی بتا سکتے ہیں۔ سنیے پروفیسر انکل۔ آپ کے ذہن
میں کوئی ایسی چیز کھانے کا خیال تو قدرتی طور پر ضرور آ سکتا

ہے، کیوں کہ آدمی کتنا بھی بوڑھا ہو جائے۔ اس کے اندر کا
بچہ بچہ ہی رہتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ ہر شخص کے اندر اس
کا بچپنا موجود رہتا ہے اور مرتے دم تک نہیں مرتا۔ لہٰذا ایسی
کسی چیز کے کھانے کی خواہش پیدا ہونا عجیب بات نہیں۔
سوال یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں روفی چاٹ کی خواہش کس
طرح پیدا ہوئی۔ خواہش تو صرف چاٹ کی پیدا ہونی چاہیے
تھی۔" فرزانہ نے یہ الفاظ پُر زور لہجے میں کہے اور سوالیہ نظروں
سے پروفیسر داؤد کی طرف دیکھنے لگی۔ انھوں نے گھبرا کر ایک
نظر خان رحمان پر ڈالی، پھر بولے:

"خ۔ خان۔ رحمان۔ اس سوال کا جواب تم دو۔"

"ل۔ لیکن پروفیسر صاحب۔ سوال تو آپ سے کیا گیا ہے۔"
خان رحمان نے گھبرا کر کہا۔

"تت۔ تو کیا ہوا۔ تم جواب دے دو۔ یہ کوئی اعتراض
نہیں کریں گے، کیوں کہ میں جانتا ہوں۔ میرا جواب سُن کر یہ
تم سے بھی یہ ہی سوال کریں گے۔"

"تب بھی۔ آخر آپ جواب کیوں نہیں دیتے۔"

"مم۔ میں جھجک محسوس کر رہا ہوں۔"

"ہوں۔ خیر میں بتائے دیتا ہوں۔ چند دنوں سے روفی چاٹ
کا اشتہار اخبارات کے پہلے صفحات پر شائع ہو رہا ہے، اور

یہ ہی نہیں۔ گھروں میں بھی اس کے اشتہار پھینکے جا رہے ہیں۔ جس طرح پوسٹ مین ڈاک ڈال جاتے ہیں، اسی طرح روفی چاٹ والے چاٹ کے اشتہارات پوسٹ بکس میں ڈال جاتے ہیں۔"

"اور۔ اور ان اشتہارات پر کیا لکھا ہوتا ہے؟"

"صرف یہ کہ روفی چاٹ سے بہتر کوئی چاٹ نہیں۔ آج ہی آزمائیے۔ روفی چاٹ کھائیے صحت مند ہو جائیے۔" خان رحمان نے بتایا۔

"حیرت ہے۔ اس قسم کا اشتہار ہمیں آج تک نہیں ملا۔" فرزانہ بولی۔

"شاید اس لیے کہ روفی چاٹ تو یہاں نزدیک ہی ملتی ہے۔"

"جی نہیں۔ میں نے تو سنا ہے۔ اب شہر میں اس چاٹ کی تین اور شاخیں کھل گئی ہیں۔"

"ہوں۔ خیر۔ یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ یہ راز معلوم ہو گیا کہ آپ لوگوں کے ذہن میں روفی چاٹ کا نام کیوں کر آیا۔ اب ہم چاٹ شروع کر سکتے ہیں۔ ارے ہاں۔ امی جان کو تو ہم بھول ہی گئے۔ پہلے میں ایک پلیٹ انھیں بھی دے آؤں۔" فرزانہ نے کہا اور ایک پلیٹ لے کر ٹفن میں سے چاٹ نکالنے لگی، اچانک اس کے چہرے پر اُلجھن تیر گئی، پھر اس کے منہ سے نکلا:

"یہ۔ یہ کیا ہے۔ چاٹ کے نیچے۔"

"چ چ۔ چاٹ کے نیچے۔" فاروق نے گڑبڑا کر کہا۔

"ہاں۔ چمچے سے کوئی چیز ٹکرائی ہے۔" یہ کہتے ہوئے فرزانہ نے ایک دوسرا چمچہ اُٹھا لیا اور دو چمچوں کی مدد سے ٹفن کی تہ میں سے کوئی چیز اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

اب ان سب نے ہاتھ روک لیے۔ یوں ابھی تک کسی نے چاٹ کو نہیں چکھا تھا۔ اور پھر انھوں نے دیکھا۔ دو چمچوں کے درمیان ایک مومی کاغذ کا بنا ہوا۔ سفید رنگ کا لفافہ تھا۔ چاٹ کے مصالحے اور دہی وغیرہ میں لتھڑا ہوا۔

فرزانہ نے اسے چٹکی سے پکڑ لیا۔ اور واش بیسن تک لے گئی۔ اس نے اسے پانی کی دھار کے نیچے رکھا تو وہ بالکل صاف ہو گیا۔

جوں ہی وہ لفافہ لیے ان کی طرف مڑی۔ زور سے اچھلی، اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

"گرین روڈ پر ایک روفی مارکیٹ ہے۔ اس کی چاٹ بہت مشہور ہے۔ ان کا شوق تھا، کالج سے فارغ ہو کر سیدھے روفی

مارکیٹ جاتے تھے اور چاٹ کھاتے تھے۔ چاٹ کھائے بغیر وُہ گھر نہیں لوٹا کرتے تھے۔" نواز جان کے باپ نے بتایا۔

"لیکن اس روز تو ارجمند کالج گیا ہی نہیں۔"

"ہاں! لیکن نواز جان کالج گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ جب ارجمند کالج نہ پہنچا تو وُہ کالج سے چھٹی لے کر اس کی خبر لینے کے لیے کالج سے نکلا۔ اس کے بعد سے اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ وُہ خبر لینے ارجمند کے گھر نہیں پہنچ سکا تھا۔ کالج سے ضرور چلا گیا تھا۔ وُہ کہاں غائب ہو گیا۔ آج پندرہ دن ہو گئے۔ کوئی پتا نہیں چل سکا۔"

"انتہائی افسوس ناک معاملہ ہے۔ ایک دوست ذہنی طور پر بے کار ہو کر رہ گیا ہے اور دُوسرا غائب ہے۔ خیر۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں نواز جان کو تلاش کروں گا۔ آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"میرا روئی کا کارخانہ ہے۔"

"شکریہ۔ اب مَیں چلوں گا۔ ہاں اگر آپ کوئی بات بتا سکیں، مہربانی ہو گی۔"

"سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکتا کہ دونوں دوست ایک دُوسرے پر جان دیتے تھے۔"

"اچھی بات ہے۔" یہ کہ کر وُہ باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر

چند لمحے سوچ میں گم رہے، آخر ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر پھر سرور راہی کی کوٹھی پہنچے۔ سرور راہی نے ان کا استقبال کیا۔

"معلومات کے دروازے بند ہیں۔ نواز جان کے والد کوئی خاص بات نہیں بتا سکے۔ دونوں روفی چاٹ کھانے کے شوقین تھے، لیکن اس روز انھوں نے چاٹ نہیں کھائی تھی، کیوں کہ ارجمند تو کالج پہنچا ہی نہیں۔ اور اس کے نہ پہنچنے پر نواز جان بھی کالج میں نہیں ٹھہرا، لیکن وُہ یہاں بھی نہیں آیا تھا۔ اس سے مَیں نے صرف اور صرف یہ اندازہ لگایا ہے کہ ان کا کوئی اور ٹھکانا بھی تھا۔ اور نواز جان ارجمند کو تلاش کرتا وہیں گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ارجمند کالج جانے سے پہلے اس ٹھکانے پر گیا تھا۔ وہاں کیا ہوا۔ اس کا ہمیں کچھ پتا نہیں۔ معاملہ ہر درجے پیچیدہ ہے۔"

"م۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا بیٹا اپنی اصلی حالت پر آ جائے۔"

"ہاں! اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کے اصلی حالت پر آنے کے ساتھ ساتھ نواز جان بھی مل جائے۔" انسپکٹر جمشید اُداس انداز میں مسکرائے۔

"اوہ ہاں! میری بھی یہی خواہش ہے۔" سرور راہی نے جلدی سے کہا۔

"خیر - آپ آرام کریں اور یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں - میں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کے کمرے کی تلاشی لینے دیں ، شاید میں کوئی کام کی چیز تلاش کر سکوں۔"

"ضرور - کیوں نہیں - آئیے۔"

سرور راہی انھیں ایک اور کمرے میں لے آئے :

"یہ ہے اس کا کمرہ - یہ رہیں الماریوں کی چابیاں۔" اس نے یہ کہہ کر میز کی دراز کھینچ لی - دوسرے ہی لمحے اس کا رنگ اڑ گیا :

"ارے یہ کیا ؟"

انسپکٹر جمشید نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز کی دراز میں دیکھا - اس میں ایک خنجر رکھا تھا - خون آلود خنجر -

لفافہ کہاں ہے

وہ فرزانہ کو اچھلتے دیکھ کر حیران رہ گئے - فاروق سے رہا نہ گیا :

"حیرت ہے - تم لفافہ کھولنے سے پہلے ہی اچھل پڑیں - اوہ میں سمجھا - تم نے وقت سے پہلے ہی اچھلنا مناسب خیال کیا - تاکہ بعد میں اچھلنے سے محفوظ رہو۔"

"احمقانہ خیال ہے۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"ہو گا۔" فاروق نے کندھے اچکائے۔

"جلدی بتاؤ فرزانہ - تم کیوں اچھلیں ؟"

"میں نے باہر کہیں گولی چلنے کی آواز سنی ہے - اور میرا اندازہ ہے - گولی رائفل کی چلی ہے - میرے کان چوں کہ تم سے تیز ہیں - اس لیے میں نے آواز سن لی۔" وہ مسکرائی۔

"میں سمجھ گیا۔" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

"کیا سمجھ گئے ؟" فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

"تم یہ چاہتی ہو کہ ہم دونوں فائرنگ کی وجہ معلوم کرنے گھر سے نکل جائیں - اور تم ہماری عدم موجودگی میں اس لفافے کو کھول لو ، لیکن ہم اتنے بے وقوف نہیں ہیں- لاؤ لفافہ ادھر دو-"

"تم نے مجھ پر جھوٹ کا الزام لگایا ہے اور یہ الزام ناقابلِ معافی ہے جب کہ تم جانتے ہو- ہم شدید ضرورت کے وقت بھی جھوٹ نہیں بولتے-"

"اوہ - یہ بھی ٹھیک ہے۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"تب پھر فوراً باہر جاؤ- اور معلوم کرو- سب خیریت تو ہے نا - میں پندرہ منٹ تک تم لوگوں کا انتظار کروں گی اور پندرہ منٹ تک اگر تم نہ آئے تو پھر لفافہ کھولنے پر مجبور ہوں گی - میرا خیال ہے ، اس صورت میں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بالکل نہیں- اور ہاں - ہمیں بہت افسوس ہے - تم پر الزام لگا بیٹھے۔" محمود بولا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔" فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے گھر سے نکل گئے - فرزانہ نے دروازہ بند کر لیا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھا :

"حیرت ہے - ابا جان آج اب تک گھر کیوں نہیں آئے ؟"

اس نے یہ الفاظ بڑبڑانے کے انداز میں کہے اور پھر فون کی طرف بڑھ گئی - خان رحمان اور پروفیسر داؤد ابھی تک ہاتھ روکے بیٹھے تھے - یہ دیکھ کر فرزانہ بولی :

"آپ لوگ تو کھائیے نا۔"

"نہیں فرزانہ - اس طرح کیا مزا آئے گا- اور پھر ابھی تم نے اپنی امی کو بھی چاٹ نہیں دی۔"

"اچھی بات ہے - چند منٹ ٹھہریے۔"

اسی وقت سلسلہ مل گیا اور فرزانہ نے فوراً کہا :

"ہیلو انکل اکرام - ابا جان اب تک گھر نہیں پہنچے - وہ یہاں مصروف تو نہیں ہیں۔"

"جی نہیں ! ایک صاحب سرور راہی آئے تھے - کسی وجہ سے پریشان تھے ، انھیں اپنے گھر لے گئے ہیں - وہ غالب کالز میں رہتے ہیں۔"

"اوہ اچھا - ٹھیک ہے۔" فرزانہ نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

"اب ہمیں پندرہ منٹ تک انتظار کرنا ہوگا - آپ کا کیا خیال ہے انکل - آپ چاٹ کھانا پسند کریں گے یا نہیں۔"

"اب تو اس چاٹ کو ہاتھ لگاتے ڈر لگ رہا ہے - ایک تو یہ بات حد درجے عجیب ہے کہ ایک ہی دن ہم دونوں کو روفی چاٹ کی خواہش نے آ گھیرا ، دوسرے اس چاٹ میں

ے لفافے کا نکل آنا بھی کچھ کم عجیب نہیں ہے ، ان حالات میں ہمیں اس چاٹ کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔" خان رحمان جلدی جلدی بولے ۔

" ہوں ! بات تو ٹھیک ہے ۔ چلیے ، چاٹ کھانے کا پروگرام کینسل اور چاٹ پر تحقیقات کا کام شروع ۔ لیکن اس کے لیے ہمیں کم از کم پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑے گا ، کیوں کہ ان دونوں سے وعدہ ہو چکا ہے ۔"

" کوئی بات نہیں ! ہم پندرہ منٹ انتظار کریں گے ۔ جمشید کے بارے میں کیا معلوم ہوا ؟"

" وہ کسی مصیبت زدہ کے ساتھ گئے ہیں ۔" فرزانہ مسکرائی ۔

" اس کا مطلب ہے ۔ واپسی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ۔"

" جی نہیں ۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ لوگ اپنی تجارت کو چمکانے کے لیے اخبارات ، ریڈیو اور ٹی وی پر اشتہارات تو ضرور دیتے ہیں ، لیکن جو طریقہ روفی چاٹ والوں نے اختیار کیا ، آج تک یہ طریقہ سننے میں نہیں آیا ۔"

" بھئی نیا زمانہ ہے ۔ نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں ۔" پروفیسر داؤد بولے ۔

" لیکن انکل ۔ چاٹ میں لفافے کا کیا کام ۔ اور پھر نہ جانے اس لفافے میں کیا ہے ؟"

" شاید کسی کے لیے کوئی پیغام ہو گا ۔" خان رحمان بولے ۔

" ہوں ! اس کا امکان ہے ، لیکن یہ چاٹ تو گاہکوں کے لیے تیار کی گئی تھی ۔" پروفیسر داؤد بولے ۔

" اصل بات تو اس کے کھلنے پر ہی معلوم ہو سکے گی ۔" فرزانہ بڑبڑائی ۔ اور لفافے کو انگلیوں سے دبا کر دیکھا :

" ہاں ! اس میں صرف ایک کاغذ موجود ہے ۔" فرزانہ بولی ۔

" تب یہ ضرور کوئی پیغام ہے ۔ حیرت ہے ۔ مجھے حیرت ہے ۔ محمود اور فاروق پیغام والی چاٹ کس طرح لے آئے ۔" خان رحمان بولے ۔

" پیغام والی چاٹ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم سب چاٹ کے چکر میں آ گئے ہوں ۔"

" چاٹ کا چکر ۔" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا ۔

آخر پندرہ منٹ بعد فرزانہ نے کہا :

" وعدہ پورا ہو گیا ، اب ہم مزید انتظار نہیں کریں گے ، انہیں صرف صورتِ حال معلوم کرنا تھی ۔ اور صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے پندرہ منٹ کافی ہیں ۔ لہٰذا میں یہ لفافہ کھولتی ہوں ۔ اجازت ہے ۔"

" ہاں بالکل ۔ ہمارا تو اپنا مارے بے چینی کے برا حال ہے ۔" خان رحمان نے جلدی سے کہا ۔

فرزانہ نے چھری کی مدد سے لفافہ چاک کیا اور اس کے اندر تہ کرکے رکھا ہوا کاغذ نکال لیا، یہ کاغذ بھی سفید رنگ کا تھا۔ کھولا تو اس پر یہ الفاظ لکھے نظر آئے:

"ٹاموتیئس بیس نو ہزار۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔" فرزانہ نے حیران ہوکر کہا۔

"لاؤ۔ مجھے دکھاؤ۔" خان رحمان بولے۔ فرزانہ نے کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا، پھر پڑھ کر پروفیسر داؤد کو دیا:

"اپنے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔ یہ تو خالص جاسوسی چکر لگتا ہے۔" پروفیسر داؤد بے چارگی کے عالم میں بولے۔

"میری عقل بھی بے بس ہے۔" خان رحمان نے کہا۔

فرزانہ نے کوئی جواب نہ دیا تو دونوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"تمھاری خاموشی سے کیا ہم یہ مطلب نکالیں کہ تم اس پیغام کا مطلب سمجھ گئی ہو؟" خان رحمان جلدی سے بولے۔

"ابھی نہیں انکل! سب سے پہلے تو غور طلب بات یہ ہے کہ ٹاموکیا بلا ہے۔" اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"صاف ظاہر ہے۔ کسی آدمی کا نام ہے۔" خان رحمان بولے۔

"اور تیئس بیس نو ہزار کیا بلا ہیں؟"

"یہ اعداد ہیں۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

"لیکن ان اعداد سے کیا رقم بنتی ہے؟"

"یہ شاید کوئی ریاضی دان بتائے گا۔" خان رحمان نے کندھے اچکائے۔

فرزانہ مسکرا دی، پھر اس نے دفتر کے نمبر ڈائل کیے، دوسری طرف سے اکرام کی بجائے محمد حسین آزاد کی آواز سنتے ہی اس نے کہا:

"انکل۔ یہ میں ہوں فرزانہ۔ ٹامو۔"

"فرزانہ ٹامو۔ یہ کیا نام ہوا۔ کیا آپ نے ٹاموتخلص رکھ لیا ہے۔" محمد حسین آزاد نے حیران ہوکر کہا۔

"نہیں انکل۔ آپ نے غلط اندازہ لگایا۔ آپ ٹامو کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟"

"کک۔ کون ٹامو؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"کیا اس نام کے کسی مجرم کو جانتے ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا ٹامو نام کی کوئی جگہ شہر میں موجود ہے؟"

"یہ دیکھنا پڑے گا۔" اس نے کہا۔

"تو پھر مہربانی فرما کر جلدی سے دیکھ لیں اور اگر معلوم ہو جائے تو فون کر دیں۔"

"اچھی بات ہے۔" محمد حسین بولا۔
فرزانہ نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

محمود اور فاروق دوڑتے ہوئے سڑک پر پہنچے۔ اُنھوں نے لوگوں کو روفی مارکیٹ کی طرف دوڑتے دیکھا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے:

"ارے! گولی تو شاید روفی مارکیٹ میں چلی ہے۔" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ کہیں یہ چاٹ ہمیں اُلجھانے کے چکر میں تو نہیں ہے۔" محمود بڑبڑایا۔

"چاٹ بے چاری کیا چکر چلائے گی۔ اسے تو خود ہم نے چکر دے دیا ہے۔" فاروق مسکرایا۔

روفی مارکیٹ کی طرف جانے والے لوگ بے تحاشا تھے، ان کی وجہ سے انھیں اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ آخر لوگوں کے درمیان سے راستا بناتے وہ مارکیٹ میں داخل ہو گئے۔ اس مارکیٹ میں زیادہ تر دکانیں جنرل مرچنٹ اور کپڑے کی تھیں، انھوں نے دیکھا، دکان دار دکانیں دھڑا دھڑ بند کر رہے

تھے۔ البتہ چاٹ کی دُکان کھلی تھی اور لوگوں کا ہجوم اس دُکان کے آگے جمع تھا۔ لوگ آگے کی طرف ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ انھیں آگے بڑھنے میں بہت دقت محسوس ہوئی۔ اسی وقت پولیس کی گاڑیوں کے سائرن گونج اٹھے۔ لوگ جلدی جلدی اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ اب ان دونوں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا اور وہ رکے بغیر آگے چلے گئے۔ عین اس جگہ۔ جہاں انھوں نے چڑھ کر ٹفن میں چاٹ کی پلیٹیں اُلٹی تھیں۔ وہاں چاٹ والے کی لاش پڑی تھی۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی تھی اور سر قریب قریب غائب ہو گیا تھا۔ تختے پر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

"ہٹو ایک طرف۔" ایک پولیس والے کی کرخت آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی انھیں دھکا دیا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر ایک طرف ہو گئے۔

"اُف اللہ۔ دن دہاڑے قتل۔" ایک سب انسپکٹر کے منہ سے نکلا۔

محمود اور فاروق نے جلدی جلدی لاش اور اِردگرد کا جائزہ لیا اور پھر پیچھے ہٹنے لگے۔ یہاں تک کہ مارکیٹ سے باہر آ گئے۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا بھئی۔" محمود نے کانپتی آواز میں کہا۔

"نہ ہم اس سے چاٹ لیتے، نہ بے چارے کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیا بکواس ہے۔ چاٹ لینے سے اس کے قتل کا کیا تعلق۔" محمود بھنّا اُٹھا۔

"شاید تم اس لفافے کو بھول رہے ہو۔ جو ہمیں چاٹ کے نیچے سے ملا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ ہمارا چاٹ خریدنے کا پروگرام اچانک بنا تھا۔ اور جس طرح ہم نے چاٹ حاصل کی۔ اس سے بھی صاف ظاہر ہے۔ وہ پلیٹیں ہمارے لیے نہیں تھیں۔ مطلب یہ کہ کچھ اور لوگوں کے لیے تھیں، لیکن لے اُڑے ان کو ہم۔ اب ظاہر ہے، اس لفافے کے بارے میں پوچھنے کے لیے ہمیں چاٹ والے کے پاس ہی آنا تھا۔ اس سے پہلے کہ ہم اس تک پہنچتے۔ اسے ختم کر دیا گیا۔" فاروق نے روانی کے عالم میں کہا۔

"اوہ!" محمود کے منہ سے نکلا۔ اچانک اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے دبی آواز میں کہا:

"خبردار فاروق۔ اس سمت میں دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔" اس کی آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

"کک۔ کس سمت میں؟" فاروق نے پریشان ہو کر کہا۔

"سڑک کی طرف۔ وہاں ایک سفید کار کھڑی ہے۔ اس

میں دو نوجوان اگلے حصے میں بیٹھے ہیں۔ پہلے وہ اطمینان سے بیٹھے تھے، لیکن ہمیں دیکھ کر نہ جانے انھیں کیا ہو گیا۔ اب نکل بھاگنے کی فکر میں ہیں۔ مطلب یہ کہ تعاقب کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس واردات سے ان کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔"

"اوہ!" فاروق نے پریشان ہو کر کہا۔

"ہمیں ان کی طرف دیکھے بغیر سڑک تک پہنچنا ہے۔ اس طرح جیسے ہم ان کی طرف سے بالکل بے خبر ہیں۔"

"لیکن جب ہم تعاقب شروع کریں گے، اس وقت تو وہ خبردار ہو ہی جائیں گے۔"

"ہم اس انداز میں تعاقب کیوں کریں گے۔" محمود نے منہ بنایا۔

وہ ٹہلنے کے انداز میں سڑک پر پہنچ گئے۔ اسی وقت سفید کار روانہ ہو گئی:

"چلو بھئی۔ وہ آ رہی ہے ایک عدد ٹیکسی۔" محمود پُرجوش انداز میں بولا۔

"لیکن اس میں اس قدر جوش میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"ضرورت ہے۔ ان لوگوں کا اس واردات سے تعلق نہ ہوتا

تو ہمیں دیکھ کر کیوں گھبرا جاتے اور نکل بھاگنے کی کوشش کیوں کرتے۔"

"اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ وہ دونوں بالکل بے وقوف ہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"وہ کیسے؟" محمود بولا۔

"ہمیں دیکھ کر چونکنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہمارے فرشتوں کو بھی ان کے بارے میں کچھ اندازہ نہ ہوتا۔"

"بھئی اسی کو کہتے ہیں، چور کی ڈاڑھی میں تنکا۔"

"لیکن۔ ان دونوں میں سے تو کسی کے چہرے پر ڈاڑھی نہیں ہے۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"مذاق نہیں بھئی۔ آج ہمیں بہت اچھا موقع ملا ہے۔ فرزانہ ساتھ نہیں ہے۔ اور ہم شاید قاتل تک پہنچنے والے ہیں۔"

"اتنی خوش فہمی بھی اچھی نہیں۔ ابھی تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس لفافے میں کیا ہے۔ جب کہ فرزانہ اب تک اسے کھول چکی ہو گی، کیوں کہ پندرہ منٹ گزر چکے ہیں۔"

"ہوں! خیر دیکھا جائے گا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

اسی وقت ٹیکسی ان کے قریب آ کر رک گئی۔ دونوں فوراً اس میں بیٹھ گئے:

"ہمارے ایک مہربان نکلے جا رہے ہیں۔ ذرا جلدی کریں،

وہ رہی سفید کار۔"

"فکر نہ کریں۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔" ٹیکسی ڈرائیور بولا۔

"کیا مطلب؟" دونوں چونکے۔

"آپ اس کار کا تعاقب کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات ہے نا۔"

"ہاں! بات تو یہی ہے۔" محمود نے منہ بنایا۔

"اور آپ محمود اور فاروق ہیں۔" اس نے کہا۔

"اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں محمود۔ تم انکار کر سکتے ہو۔" فاروق مسکرایا۔

"نن۔ نہیں۔" محمود نے ہکلا کر کہا۔

"شکریہ۔ انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔"

ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھی:

"لیکن جناب۔ آپ کا کمال ہم اس وقت مانیں گے جب آپ ان لوگوں کو تعاقب کا احساس نہ ہونے دیں۔" محمود نے کہا۔

"اچھی بات ہے، میں پوری کوشش کروں گا۔" اس نے کہا۔

تعاقب پندرہ منٹ تک جاری رہا، پھر ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے:

"آپ ناکام ہو گئے جناب" محمود نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"ہاں! یہ لوگ بلا وجہ اِدھر اُدھر جا رہے ہیں اور انھوں نے تعاقب کا اندازہ لگا لیا ہے۔ مجھے افسوس ہے۔"

"کوئی بات نہیں - پروا نہ کریں۔"

"تو کیا- تعاقب بند کر دیا جائے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"نہیں- تعاقب تو اب جاری رہے گا- انھیں معلوم ہو گیا ہے تو کیا ہوا" فاروق نے سر کو جھٹکا دیا۔

"بہت بہتر" اس نے کہا۔

اُسی وقت سفید کار نے ایک اور موڑ کاٹا اور پھر ایک سڑک پر ہو لی:

"اوہو! ان کا ارادہ تو شہر سے باہر جانے کا معلوم ہوتا ہے" ڈرائیور چونکا۔

"تو کیا ہوا- شہر سے باہر جانے کے تو ہم بھی ماہر ہیں" فاروق نے چہک کر کہا۔

"آپ ضرور ہوں گے، لیکن میں نہیں" اس نے گھبرا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں- آپ ہمیں اُتار کر واپس آجائیے گا، ہم اعتراض نہیں کریں گے"

"اور آپ واپس کس طرح آئیں گے" ڈرائیور نے فکر مند ہو کر کہا۔

"کسی نہ کسی طرح آجائیں گے، کیوں کہ ہم کسی نہ کسی طرح آنے کے بھی ماہر ہیں۔"

"ہم- میں جانتا ہوں جناب- آپ بے شمار کاموں کے ماہر ہیں" اس نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

اسی وقت سفید کار جنگل میں ایک موڑ مڑ گئی- جب وہ اس جگہ پہنچے تو انھوں نے دیکھا- جنگل کی طرف ایک کچی سڑک موجود تھی، سفید کار اس پر گئی تھی اور نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی-

"میرا خیال ہے- مجھے تو یہیں سے اجازت دے دیں- میں کچی سڑک پر ٹیکسی نہیں اُتاروں گا" ڈرائیور نے پریشان ہو کر کہا-

"شاید آپ ہم سے کچھ زیادہ ہی واقف ہیں- خیر آپ جا سکتے ہیں" محمود نے مسکرا کر کہا-

انھوں نے بل ادا کیا اور وہ تیر کی طرح شہر کی طرف چلا گیا-

"بے چارہ- بہت خوف زدہ تھا" فاروق نے کہا-

اب دونوں کچی سڑک پر چل پڑے- جلد ہی انھیں ایک عمارت نظر آئی - سفید کار اس کے دروازے پر کھڑی تھی- عمارت ہندووانہ طرز کی تھی اور بہت پرانی بھی-

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہمیں گھیر کر اِدھر لائے ہیں۔"
فاروق بڑبڑایا۔

"ہمارے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ مُجرم ہمیں گھیر گھار کر اپنے اڈے پر لے آئیں۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"تو کیا تمھارا ارادہ اس مکان میں داخل ہونے کا ہے؟"

"تو اور یہاں کس لیے آئے ہیں۔" اس نے منہ بنایا۔ اور آگے بڑھ کر عمارت کے دروازے پر دستک دی۔ ایسے میں فاروق کا دل زور سے دھڑکا۔ وُہ کہے بغیر نہ رہ سکا:

"اسے کہتے ہیں۔ آ بیل مجھے مار۔"

"بھئی اس طرح وقت کم ضائع ہو گا۔ دیکھو نا۔ ہم جنگل میں چھپ کر ان کی نگرانی کرتے رہیں گے۔ کرتے رہیں گے۔ نہ جانے یہ کب باہر نکلیں اور کدھر کا رُخ کریں۔ کیوں نہ ہم ہی ان سے مُلاقات۔"

اسی وقت دروازہ کھُلا۔ اور ایک نوجوان کی صورت نظر آئی۔ انھوں نے اسے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے دیکھا تھا:

"تشریف لے آیئے جناب۔ اندر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

"بہت خوشی ہوئی یہ جان کر۔" محمود بولا۔ اور اس کے

پیچھے اندر داخل ہوئے۔ اندر داخل ہوتے ہی انھیں ایک بہت بڑا صحن دکھائی دیا۔ اس میں سامنے والی دیوار کے ساتھ نیلے رنگ کا ایک بُت نصب تھا۔ نیلے پتھر کا بنا ہوا۔ ایک بُت جس پر چادر اُڑھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سُرخ اور سفید رنگ کے دائرے سے بنے ہوئے تھے۔ آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وُہ دیوار کے ساتھ کمر لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ نیچے ایک پُختہ چبوترا تھا۔ بڑا سا چبوترا۔ بُت کے دائیں طرف کرُسیاں بچھی تھیں۔ ان کرُسیوں میں سے ایک پر وُہی نوجوان بیٹھا تھا جو سفید کار میں یہاں تک آیا تھا اور اس کے علاوہ آٹھ آدمی اور تھے۔ بُت کے دائیں بائیں دو آدمی بالکل سیدھے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں — دونوں رائفلوں کا رُخ ان کی طرف تھا۔ بُت کے نزدیک والی کرسی پر ایک سڈول جسم والا آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ اچانک اس کی آواز گونجی:

"تو یہ ہیں وُہ دونوں۔"

"یس باس۔" وُہ بولا جو انھیں اندر لایا تھا۔

"لفافہ کہاں ہے؟" باس نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"کون سا لفافہ جناب۔ ہم ڈاک خانے کے مُلازم نہیں۔" فاروق نے بُرا مان کر کہا۔

"یہ اس نے کیا کہا؟" باس پھنکارا۔

"اس کی طبیعت ذرا مزاحیہ ہے باس۔ انسپکٹر جمشید کا منجھلا بیٹا ہے۔"

"لیکن یہ روفی کی دکان پر کیا لینے گئے تھے؟" باس نے بھنا کر کہا۔

"چاٹ۔ چاٹ بھی انھوں نے عجیب طریقے سے حاصل کی اور اس طرح ان کے برتن میں ایک خاص پلیٹ کی چاٹ بھی چلی گئی، لہٰذا فوری طور پر روفی کو ختم کرنا پڑا۔"

"گویا ان بدبختوں کی وجہ سے ہمیں اپنے ایک بہترین کارکن سے ہاتھ دھونا پڑے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم ان دونوں سے روفی کا انتقام لیں گے۔"

"آپ اس وقت تک انتقام نہیں لے سکتے۔ جب تک کہ لفافہ آپ کے ہاتھ نہیں لگ جاتا۔" محمود نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"کیا مطلب؟" باس نے چونک کر کہا۔

"ہمارے والد اس خط کا راز جان لیں گے اور پھر انھیں تم لوگوں تک پہنچنے سے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ تب پھر جانتے ہو کیا ہو گا، وہ تمھاری اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔"

"بہت دیکھے ہیں اینٹ سے اینٹ بجانے والے۔ پہلے

تم دونوں تو اپنی اینٹ سے اینٹ بجواؤ۔" اس نے غرّا کر کہا، پھر اپنے دائیں بائیں کھڑے محافظوں سے بولا:

"انھیں پکڑ کر چبوترے پر لٹا دو۔ اور ذبح کر دو۔"

"مسٹر باس۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہو گا۔" محمود نے پُرسکون آواز میں کہا۔

"میں بھی یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ کام میرے لیے کس حد تک آسان یا مشکل ہے۔" اس نے بُرا سا مُنہ بنایا۔

"لل۔ لیکن باس۔ ہم کیوں نہ پہلے وہ لفافہ حاصل کر لیں۔ تاکہ انسپکٹر جمشید کے یہاں تک پہنچنے کے امکانات ختم ہو جائیں۔"

"کیا بکواس ہے۔ کیا میں انسپکٹر جمشید سے ڈرتا ہوں۔" باس نے چیخ کر کہا۔

"یہ بات نہیں باس۔ آخر ہم کوئی خطرہ کیوں مول لیں۔" سفید کار کا ڈرائیور بولا۔

باس سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس نے کہا:

"ہوں اچھا۔ تم جاؤ۔ راجو اور بارو کو ساتھ لے جاؤ۔ تاکہ کوئی دشواری پیش آئے تو تم ان کی مدد سے کام مکمّل کر سکو۔"

"شکریہ سر۔" سفید کار کے ڈرائیور نے کہا، پھر وہ بیرونی دروازے کی طرف مُڑا۔

"لیکن اتنا خیال رہے رٹالی۔ یہ کوشش صرف اس صورت میں

کرنی ہے جب انسپکٹر جمشید اس لفافے کو پڑھ نہ چکے ہوں۔ اگر انھوں نے لفافے کو کھول کر دیکھ لیا ہو تو پھر تم خاموشی سے واپس چلے آنا۔"

"اوکے باس! میں سمجھ گیا۔" رٹالی بولا، پھر اپنے ساتھی کی طرف مڑا:

"آؤ اجو۔ چلیں۔ راجو، بارو تم بھی آؤ۔"

دوسرے ہی لمحے وہ چاروں عمارت سے نکل گئے۔ محمود اور فاروق نے صحن کا جائزہ لیا۔ ان کے مقابلے میں اب بھی دس گیارہ آدمی تھے اور ان میں سے دو کے ہاتھوں میں رائفلیں بھی تھیں جن کی نالیں ان ہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کا پروگرام انھیں ختم کرنے کا تھا۔ محمود نے سفید لفافے کو آڑ بنا کر کچھ وقت ضرور حاصل کر لیا تھا، لیکن اس کا فائدہ اسی وقت تھا جب وہ کچھ کر گزرتے۔ یہ ہی سوچ کر محمود پہلے تو بھرپور انداز میں مسکرایا اور پھر بولا:

"میں نے ذہانت سے کام لے کر ان میں سے چار کو تو یہاں سے رخصت کر دیا۔ ان کی عقل مندی تو دیکھو۔ ہماری تلاشی تک نہ لی اور لفافہ لانے چلے گئے۔"

"کیا مطلب۔ کیا لفافہ تم لوگوں کے پاس ہی ہے۔ ارے۔ روکو انھیں۔ وہ بے کار وہاں جا رہے ہیں۔ کہیں انسپکٹر جمشید ان کے

ذریعے یہاں نہ پہنچ جائے۔"

باس کی آواز میں اس قدر گھبراہٹ تھی کہ چار اور آدمی دوڑتے ہوئے صحن سے باہر نکل گئے۔ اب فاروق نے چہک کر کہا:

"اسے کہتے ہیں، ہینگ لگے نہ پھٹکڑی۔ رنگ چوکھا آئے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"لفافہ ہمارے پاس نہیں ہے۔" محمود بولا۔

"کیا!" باس نے چیخ کر کہا اور پھر بقیہ ساتھیوں سے بولا:

"جو بعد میں گئے ہیں۔ انھیں روک لو۔ پہلے چار کو انسپکٹر جمشید کے گھر جانے دو۔"

یہ الفاظ اس نے چیخ کر کہے۔ ایک منٹ بعد وہاں صرف تین آدمی رہ گئے۔ دو رائفلوں والے، تیسرا باس۔

"ارے۔ تم کیوں رہ گئے۔ کیا تم نے باس کا حکم نہیں سنا؟"

محمود چیخا۔ اشارہ دونوں رائفلوں والوں کی طرف تھا۔ لیکن انداز ایسا تھا جیسے کوئی ان کے پیچھے کھڑا ہو۔ دونوں رائفلوں والے بے ساختہ انداز میں مڑے اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب محمود اور فاروق نے ایک ساتھ ان پر چھلانگیں لگائیں۔ وہ ان کے ساتھ دھڑام سے گرے۔ اٹھے تو رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور وہ باس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ رائفلیں باس کی کن پٹیوں پر تھیں:

"مسٹر باس۔ اپنے ان دونوں ساتھیوں سے کہو۔ ہاتھ اوپر کر کے کھڑے ہو جائیں۔ ورنہ ہم نے تمہارا تو کام کر دیا تمام۔" محمود غرایا۔

"ہاتھ۔ ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" باس ہکلایا۔

وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ان کے ہاتھ بھی سر سے اوپر اُٹھ گئے۔ ان کے چہروں پر حیرت کا ایک عالم طاری تھا۔

"اسے کہتے ہیں، عقل بڑی یا بھینس۔ آخر آج ثابت ہو ہی گیا کہ عقل بڑی ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"آ۔ آج ثابت ہوئی ہے یہ بات۔ دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"ایسے میں دماغ چل جائے تو بھی کوئی بات نہیں۔" فاروق ہنسا۔

اسی وقت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور باس کے ساتھی اندر داخل ہوئے:

"ہم نے ان چاروں کو انسپکٹر جمشید کے ہاں بھیج دیا ہے باس۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ ابھی ان کی نظریں یہ جائزہ نہیں لے پائی تھیں کہ اندر پانسہ پلٹ چکا ہے۔

"اور تم نے بہت اچھا کیا۔ انھیں وہاں چلے ہی جانا چاہیے تھا۔" فاروق بولا۔

"ارے۔ یہ کیا۔" وہ اچھل پڑے۔ صورتِ حال اب ان کی سمجھ میں آئی۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ بس ذرا اپنے ہاتھ سروں سے بلند کر لو۔ ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔ اور گولی چلانے کا نتیجہ کیا ہو گا، شاید تم جانتے ہی ہو گے۔"

ان کے ہاتھ فوراً اوپر اُٹھ گئے۔

"ہاں مسٹر باس۔ اب بتاؤ۔ یہ سارا چکر کیا ہے؟"

"کک۔ کون سا چکر۔" باس ہکلایا۔

"یہ۔ چاٹ کا چکر۔ لفافے کا چکر۔ اس عمارت کا چکر۔ کوئی ایک چکر تو نہیں۔ یہاں تو چکر ہی چکر ہیں۔"

"مم۔ میں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ مم۔ میں نقلی ہوں۔"

دُوسرا نشان

سرور راہی کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا تو دُوسرا جا رہا تھا۔ خنجر پر لگا خون خشک ہو کر سیاہ پڑ چکا تھا۔ گویا کئی دن پہلے خنجر رکھا گیا تھا:

"یہ ایک خُون آلود خنجر ہے جناب۔ اور آپ کے بیٹے کے کمرے میں موجُود ہے۔ شاید کئی دن پہلے یہاں رکھا گیا ہے۔ کیوں کہ خُون خشک ہو کر سیاہ ہو چکا ہے۔ اب تو آپ کی سمجھ میں اس کی بیماری آ گئی ہو گی۔"

"کک۔ کیا مطلب؟" سرور راہی نے چونک کر کہا۔

"دراصل نواز جان آپ کے بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس خنجر سے اس نے اسے ہلاک کیا ہے۔"

"نن۔ نہیں۔ نہیں۔ میرا بیٹا یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا۔ وہ تو ایک چیونٹی بھی نہیں مار سکتا۔"

"یہی کہا کرتا ہے۔ آئیے ذرا اس سے بات

کریں۔ میرا خیال ہے۔ اب وہ بولنے کے قابل ہو جائے گا۔"
ان کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب۔ کیا وہ یہ جُرم کر کے گونگا بن گیا ہے۔ یہی کہنا چاہتے ہیں آپ۔"

"ہاں! اپنے جُرم پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش کر سکتے ہیں۔ لیکن میں حیران ہوں۔ اسے خنجر یہاں لا کر رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خنجر بھی تو کہیں دفن کر سکتا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے رُومال کی مدد سے خنجر اُٹھا لیا۔ تاکہ اس پر موجُود نشانات نہ مٹ جائیں۔ اب دونوں اس کمرے میں آئے۔ جہاں ارجمند لیٹا ہوا تھا۔

"مسٹر ارجمند۔ اس خنجر کو پہچانتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے اس کے نزدیک ہو کر خنجر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ آنکھیں خنجر کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی نظر آئیں۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس کے منہ سے آواز نکلی:

"ہاں! یہی وہ خنجر ہے۔ جس کے ذریعے میں نے اپنے دوست کو ہلاک کیا ہے۔ اس۔ اس کی لاش جنگل میں دبا دی تھی میں نے۔"

"نہیں!" سرور راہی پوری قوّت سے چیخا۔

اس کی چیخ نے گویا پوری کوٹھی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ملازمین

کے دوڑتے قدموں کی آواز سے برامدہ گونج اُٹھا، پھر وُہ کمرے
کے دروازے پر آکر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے
ڈرتے ڈرتے کہا:

"خ خ۔خیر تو ہے جناب؟"

"ہاں۔تم لوگ جاؤ۔ اپنا کام کرو۔" اس نے کھوئے کھوئے
انداز میں کہا۔

وُہ واپس مُڑ گئے۔انسپکٹر جمشید پولیس کی گاڑی کے لیے فون
کرنے لگے:

"اب۔اب کیا ہوگا انسپکٹر صاحب؟"

"ہم اس جگہ جائیں گے جس جگہ لاش دفن ہے۔اور پھر آپ
کے بیٹے کو گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"ک ک۔کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔کہ اسے گرفتار نہ کیا جائے۔"
سرور راہی نے کانپتی آواز میں کہا۔

"یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔مجرم کو سزا مل کر رہتی ہے۔"

"انسپکٹر صاحب۔ہمارے ملک میں کیا نہیں ہو سکتا۔یہ راز اس
وقت تک صرف اور صرف آپ کو معلوم ہے، آپ اگر اس راز
کو اپنے تک رکھ لیں تو میرا بچہ بچ سکتا ہے۔" سرور راہی نے
گڑ بڑا کر کہا۔

"افسوس۔یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میرے پاس جو کچھ ہے۔سب آپ لے لیں۔بس میرے بچے
کو جیل جانے سے بچا لیں۔"

"افسوس۔یہ ممکن نہیں۔میں رشوت نہیں لیتا۔" وُہ بولے۔

"انسپکٹر جمشید۔مجھ پر رحم کریں۔میرا یہی ایک بچہ ہے۔"

"کاش! ایسا کرنا میرے بس میں ہوتا، لیکن یہ معاملہ قانون
کا ہے۔" وُہ بولے۔

سرور راہی کا سر جھک گیا۔اور پھر پولیس کی گاڑی آ
پہنچی۔

"اُٹھیے مسٹر ارجمند۔آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔اسی جگہ۔
جہاں آپ نے اپنے دوست کو دفن کیا ہے۔"

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"یہ کہ اس بے چارے کی باقاعدہ قبر بنے۔"

"ہاں! اب ایسا ضرور ہو گا، لیکن مسٹر ارجمند۔آپ نے اسے
کیوں قتل کیا؟"

"م م۔میں۔کیوں قتل کیا۔" اس نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"ہاں۔کیوں کیا؟"

"پ پ۔پتا نہیں۔کیا بات تھی۔اب یاد نہیں آ رہی۔" وُہ
ایسے بولا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔

"اچھا خیر۔ اب اُٹھیے۔"

وہ وین میں بیٹھ گئے۔ اور ارجمند کی بتائی ہوئی سڑک پر چل پڑے۔ شہر سے باہر ایک جگہ اس نے رُکنے کا اشارہ کیا اور چلا اُٹھا:

"یہی ہے وہ جگہ۔"

اس کی نشان دہی پر گڑھا کھودا گیا۔ اور پھر لاش گڑھے سے نکال لی گئی۔ خنجر اس کے پیٹ میں مارا گیا تھا۔ انسپکٹر جمشید نے اکرام سے کہا:

"جاؤ اکرام۔ اس غریب باپ کو بھی یہاں لے آؤ۔ جو پندرہ دن سے اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہے۔ ۱۱۵ غالب کارنر پر رہتا ہے۔"

"او کے سر۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔

عملہ اپنا کام کرتا رہا۔ خنجر پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھوائے گئے۔ آخر نواز جان کا باپ وہاں پہنچ گیا۔ اطلاع اسے پہلے ہی دے دی گئی تھی۔ اس لیے روتا ہوا وہاں تک پہنچا۔ بیٹے کی لاش دیکھ کر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ارجمند کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ سرور راہی بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا، کر ہی کیا سکتا تھا:

"مسٹر ارجمند۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اب تک یہی بات تو سمجھ میں نہیں آئی کہ میں نے ایسا

کیوں کیا۔" اس نے کہا۔

"آپ اس دن گھر سے کالج جانے کے لیے نکلے تھے۔ پھر کالج کیوں نہیں پہنچے؟"

"پتا نہیں۔ میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہوں۔ آپ ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ آپ کی یاد داشت واپس لانا پڑے گی۔ غالباً صدمے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ خیر۔ آپ اتنا تو بتا سکتے ہیں کہ نواز جان سے آپ کو کیا تکلیف پہنچی تھی؟"

"یہی تو مصیبت ہے۔ کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی۔ وہ تو میرا بہت گہرا دوست تھا۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اکرام۔ مسٹر ارجمند کو پہلے ہسپتال لے جانا ہوگا۔"

"او کے سر۔"

اور وہاں ان کی پوری طرح نگرانی بھی کی جائے گی۔ کوئی انھیں ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرے۔ نہ یہ خود کو ہلاک کرنے کی کوشش کریں۔"

"بہت بہتر۔"

اس وقت فنگر پرنٹ سیکشن کا ایک آدمی ان کی طرف آیا:

خنجر پر مسٹر ارجمند کی انگلیوں کے نشانات پوری طرح موجود ہیں سر۔ لیکن۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

"ایک اور انگلی کا نشان بھی موجود ہے۔"

"اوہو اچھا۔ یہ تو ایک بہت کام کی بات معلوم ہوئی۔ اکرام۔ تم دوسرا نشان ریکارڈ سے ملا کر دیکھو۔ شاید کسی سے مل جائے۔"

"او کے سر۔"

"ابھی تک ہم یہ معلوم نہیں کر سکے کہ ارجمند صاحب اس صبح کالج کیوں نہیں پہنچے تھے۔ پھر نواز جان اس کی تلاش میں نکلے تو ان کی ملاقات اس جگہ کس طرح ہو گئی۔ اور ہو ہی گئی تھی تو ارجمند نے نواز جان کو ہلاک کیوں کر دیا۔ بہرحال نصف کیس حل ہو چکا ہے۔ لاش بھی مل گئی۔ قاتل بھی پکڑا گیا۔ رہ گئی یہ بات کہ وجہ کیا تھی۔ تو شاید یہ بات ارجمند کی یادداشت لوٹنے پر معلوم ہو سکے گی، چنانچہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

اور یہ مختصر سا قافلہ شہر کی طرف روانہ ہوا۔ اکرام نے ہسپتال کا رُخ کیا اور وُہ گھر کی طرف چل پڑے۔ پھر گھر کا کھلا دروازہ دیکھ کر ٹھٹک گئے، کیوں کہ ان کے گھر کا دروازہ عام طور پر کھلا نہیں ہوتا تھا۔

"دروازے پر کوئی اجنبی شخص موجود ہے۔ آپ لوگ ذرا ہوشیار ہو جائیں۔ حالات عجیب و غریب ہیں۔"

"اچھا۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم پوری طرح ہوشیار ہیں۔" خان رحمان نے کہا اور جیب سے پستول نکال لیا۔

"یہ مناسب نہیں رہے گا انکل۔" فرزانہ نے کہا۔

"کیا مناسب نہیں رہے گا۔"

"اس طرح پستول نکال کر بیٹھ جانا۔ مہربانی فرما کر آپ دونوں ہمارے کمرے میں چلے جائیں۔ اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر حالات کا جائزہ لیتے رہیں۔"

"بھئی واہ۔ یہ ہوئی نا ترکیب تو۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"کام جو ان کا ہے۔" خان رحمان بھی مسکرائے۔ پھر دونوں ان کے کمرے میں چلے گئے۔ ادھر بیگم جمشید باورچی خانے میں تیار ہو گئیں۔ انھوں نے کھولتا ہوا پانی کیتلی میں تیار رکھ لیا۔

فرزانہ نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی، پھر دروازے کی طرف مُڑی ہی تھی کہ لفافے کا خیال آگیا۔ اس نے لفافہ اُٹھایا اور ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

اب وُہ دروازے پر آئی اور پُرسکون آواز میں بولی:

"کون ہے؟"

"ڈاکیا۔ میرے پاس ایک رجسٹری ہے۔"

" اوہ شکریہ" اس نے دل ہی دل میں مسکرا کر کہا، کیوں کہ آواز ان کے پوسٹ مین کی نہیں تھی۔ پھر اس نے بے دھڑک انداز میں دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی چار بلے تڑنگے آدمی اندر داخل ہو گئے۔ اور فرزانہ کو دھکیلتے ہوئے صحن تک لے آئے۔ انھوں نے دروازہ بھی اندر سے بند کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

" اوہو۔ کیا مصیبت آگئی ہے۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

" وہ لفافہ کہاں ہے؟"

" کک۔ کون سا لفافہ؟"

" جو چاٹ میں سے ملا ہے۔"

" کک۔ کون سی چاٹ؟" فرزانہ ہکلائی۔

" وہی جو تمھارے بھائی روفی مارکیٹ سے لائے تھے۔"

" اوہ۔ تو یہ اس چاٹ کی بات ہو رہی ہے۔" فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

" چاٹ کی نہیں۔ اس لفافے کی بات ہو رہی ہے۔"

" شکریہ۔ دیکھ لیں۔ اگر کوئی لفافہ ملتا ہے تو لے جائیں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

دیکھنے کا ہمارے پاس وقت نہیں۔ یا تو لفافہ نکالو۔ ورنہ ہم تمھارا خاتمہ کرتے ہیں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی ان چاروں کے

ہاتھوں میں خنجر نظر آئے۔

" ارے باپ رے۔ تمھارے ارادے تو خطرناک ہیں۔ ایسا بھی کیا۔" فرزانہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی۔

عین اسی وقت ایک فائر ہوا۔ ان میں سے ایک کے منہ سے چیخ نکلی۔ اور اپنی پنڈلی پکڑ کر بیٹھ گیا، باقی تین گھبرا کر مڑے، لیکن حملہ آور کہیں بھی نظر نہیں آیا:

" ارے۔ یہ گولی کس نے چلائی؟"

" میرے فرشتوں نے۔" فرزانہ بولی۔

" دوسری گولی بھی آ سکتی ہے۔ اس لیے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" خان رحمان نے آواز لگائی۔

ان کے رنگ اڑ گئے۔ خنجر ہاتھوں سے نکل گئے۔ ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

" بھئی واہ۔ یہ تو بہت آسان شکار ثابت ہوئے۔" پروفیسر داؤد خوش ہو کر بولے۔

دونوں کمرے سے نکل آئے۔

" پروفیسر صاحب۔ آپ ان کے خنجر اٹھانا پسند کریں گے۔" خان رحمان بولے۔

" نن۔ نہیں بھئی۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں چل نہ جائیں۔" وہ گھبرا کر بولے۔

"لیکن پروفیسر صاحب۔ میں خنجروں کی بات کر رہا ہوں، پستولوں کی نہیں۔"

"تت تو۔ تو کیا خنجر نہیں چل سکتے۔" انھوں نے بوکھلا کر کہا۔

"بالکل نہیں۔" وہ بولے۔

"آپ فکر نہ کریں انکل۔ میں نے خنجر اٹھا لیے ہیں۔" فرزانہ ہنسی۔

"ہاں بھئی۔ اب تم بتاؤ۔ تمھیں لفافے کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔"

"باس کو پتا ہے۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اور تمھارا باس کہاں ہے؟"

"جہاں سے ہم آئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"بہت مناسب جواب ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے۔ تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟"

"جنگل میں سے۔ وہاں ہمارا باس موجود ہے۔ کیا تم وہاں جانا پسند کرو گے۔"

"کیا خیال ہے انکل۔ یہ ہمارے خلاف چال بھی ہو سکتی ہے، کہ ہم سب وہاں جا کر پھنس جائیں۔"

"ہوں۔ جمشید سے مشورہ کیے بغیر اس طرح جانا مناسب نہیں۔ لیکن جمشید کو بھی آج ہی لیٹ ہونا تھا۔"

"وہاں محمود اور فاروق بھی موجود ہیں۔" نوجوان نے کہا۔

"کیا کہا۔" وہ ایک ساتھ چلائے۔

"ہاں! روفی مارکیٹ میں روفی چاٹ والا مارا گیا تھا۔ مارنے والوں میں سے دو ایک جگہ کھڑے حالات کا جائزہ لے رہے تھے کہ محمود اور فاروق وہاں پہنچ گئے۔ وہ دونوں وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ محمود اور فاروق نے ان کا تعاقب کیا اور اس طرح ہمارے اڈے میں جا پھنسے۔ ہم اب وہیں سے آ رہے ہیں۔"

"میں پھر کہوں گی۔ یہ ایک چال بھی ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر۔ اب کیا کریں۔ محمود اور فاروق کا معاملہ ہے۔"

"مم۔ میرے خیال میں تو چلنا ہی چاہیے۔ ورنہ محمود اور فاروق کیا خیال کریں گے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"بات یہ بھی ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ۔" خان رحمان نے کہا۔

وہ برآمدے کی طرف مڑے اور پھر ٹھٹک کر رہ گئے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوئے تھے۔

"یہ بہت اچھا ہوا۔" خان رحمان چہک کر بولے۔

"کیا اچھا ہوا؟"

"تم عین وقت پر آئے جمشید۔ ہم مہم پر روانہ ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اگر تم ایک منٹ تک اور نہ آتے تو ہم جا چکے تھے۔"

"کیسی مہم بھئی۔ یہ مہم کہاں سے ٹپک پڑی۔" وہ حیران ہو کر بولے۔

"بہت اچھی مہم جمشید۔" خان رحمان بولے۔

"اتنی اچھی کہ محمود اور فاروق اس میں پہلے ہی پھنس چکے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا۔

"بات یہ ہے ابا جان کہ پروفیسر انکل اور انکل خان رحمان ہمارے ہاں چاٹ کھانے آئے تھے۔"

"کیا کھانے آئے تھے۔ چاٹ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں چاٹ۔ محمود اور فاروق ان کے لیے چاٹ لے آئے، لیکن اسی وقت باہر گولی کی آواز گونجی۔ دونوں حالات معلوم کرنے نکلے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ اب یہ حضرات یہاں آئے۔ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ وہ دونوں ان کے ٹھکانے میں پھنس گئے ہیں۔ یہ ہم سے وہ لفافہ حاصل کرنے آئے ہیں جو چاٹ میں سے نکلا ہے۔"

"چاٹ میں سے لفافہ نکلا ہے۔" انسپکٹر جمشید کھوئے کھوئے

انداز میں بولے۔

"جی ہاں! ٹھہریے میں آپ کو تفصیل بتاتی ہوں۔ یہ سارا معاملہ دراصل روفی چاٹ کے گرد گھومتا ہے۔"

"کیا۔ روفی چاٹ۔" انسپکٹر جمشید چلّا اُٹھے۔

ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں —

عجیب دن

"کیا کہا۔ تم نقلی ہو۔" محمود حیران ہو کر بولا۔

"ہاں! میں بالکل نقلی باس ہوں۔ میرے فرشتوں کو بھی نہیں خبر کہ اصلی باس کون ہے۔ اور اس کا کام کیا ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔" فاروق نے بُرا سا منہ بنایا۔

"مجھے اس نے حکم دے رکھا ہے کہ یہاں موجود رہوں اور اس کی طرف سے جو ہدایات ملیں، وہ ان لوگوں کو دیتا رہوں۔ خود ان لوگوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اصلی باس نہیں ہوں۔"

"اور وہ تمہیں ہدایات کس طرح دیتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"شہری حدود شروع ہوتے ہی ایک پبلک فون بوتھ آتا ہے۔ ہر روز صبح منہ اندھیرے اس بوتھ کے اندر ٹیلی فون کے نیچے سے مجھے ایک ہدایت نامہ ملتا ہے۔ میں اسے ذہن نشین کر لیتا ہوں۔ اور پھر ماتحتوں کو ہدایات دیتا ہوں۔"

"یہ ہدایات کس قسم کی ہوتی ہیں؟" فاروق نے پوچھا۔

"اس قسم کی۔ کہ فلاں جگہ سے مال وصول کرنا ہے، فلاں جگہ جا کر انتظار کرنا ہے۔ فلاں جگہ جا کر یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔ بس اسی قسم کی ہدایات ہوتی ہیں۔ جو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ مجھے تو بس اپنی تنخواہ سے غرض ہے۔ جو معقول ہے۔"

"اور تنخواہ تمہیں کس طرح ملتی ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ اسی فون کے نیچے رکھی مل جاتی ہے۔"

"تو تمہیں یہ پتا نہیں کہ وہ مال کس قسم کا ہوتا ہے۔"

"جی نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"ان لوگوں کو تو معلوم ہو گا۔" محمود باقی لوگوں کی طرف مڑا۔

"جی نہیں۔ بنڈلوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ کھول کر دیکھنے کی ہمیں اجازت نہیں ہے، اس لیے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ مال کیا ہوتا ہے۔"

"بنڈل بڑے ہوتے ہیں یا چھوٹے؟"

"کافی بڑے ہوتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں! کبھی اندازہ لگانے کی کوشش تو کی ہو گی کہ بنڈلوں میں کیا ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ اندازہ لگانے کا وقت ہی کسے ملتا ہے۔ ادھر سے

بنڈل لیا، ادھر پہنچایا۔" ایک نے کہا۔

"خیر۔ اب تم لوگوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔ یا پھر ایسے کر لیتے ہیں کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ ہم شہر جا کر پولیس کو ادھر بھیج دیتے ہیں، اس وقت تک تم لوگوں کو پولیس کا انتظار کرنا ہوگا۔" فاروق نے جلدی جلدی کہا۔

"کیا کہ رہے ہو فاروق۔ بھلا یہ لوگ یہاں رُک کر پولیس کا انتظار کیوں کرنے لگے، ان کا دماغ تو نہیں چل گیا۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"تو کیا تمہارے خیال میں میرا دماغ چل گیا ہے۔ ارے بھئی۔ ہم ان لوگوں کو باندھ کر جائیں گے۔" فاروق مسکرایا۔

"اوہ ٹھیک ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انہیں تم باندھو گے یا میں۔"

"باندھنے کے ماہر تم ہو، میں نہیں۔" فاروق نے فوراً کہا۔

ابھی وہ رسی کی تلاش میں نظریں دوڑا ہی رہے تھے کہ چند گاڑیوں کی آوازیں کانوں تک آئیں:

"یا اللہ رحم۔ اب کون آ گیا؟" محمود نے چونک کر کہا۔

"ضرور یہ ہمارے ہی ساتھی ہوں گے۔ کیوں کہ فرزانہ، انکل خان رحمان، پروفیسر انکل اور امی جان بھلا ان چاروں سے شکست کہاں کھا سکتے تھے۔ ضرور انھوں نے ان چاروں پر قابو

پا لیا ہوگا اور اب وہ انہیں لے کر ادھر آئے ہوں گے۔" فاروق نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہوں۔ بات تو ٹھیک ہے۔"

اُسی وقت بھاری قدموں کی آواز سُنائی دی اور پھر وہ زور سے اُچھلے۔ ساتھ ہی دو فائر ہوئے۔ وہ فوراً زمین پر گرے۔ ساتھ ہی ان پر کئی آدمی ٹوٹ پڑے۔ تابڑ توڑ مکے جو پڑے تو انہیں بے ہوش ہونے میں دیر نہ لگی۔

ہوش آیا تو وہ ایک بڑے کمرے کے فرش پر لیٹے تھے، ٹھنڈا فرش ان کے جسموں میں ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ اچانک اُنھوں نے قدموں کی آواز سُنی۔ سر گھما کر دیکھا تو لمبے قد کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں، آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک تھی۔ ان سے قدرے فاصلے پر آ کر وہ رک گیا:

"تم لوگوں کو بھی چین نہیں۔ ہر معاملے میں اپنی ٹانگ گھسیٹ دیتے ہو۔" اس نے ناخوش انداز میں کہا۔

"آپ کی تعریف؟"

"اصلی باس۔" اس نے کہا۔

"نقلی باس مقرر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" محمود بولا۔

"وُہی ضرورت تو اس وقت کام آئی۔ ورنہ تمہاری زد

پر شاید میں ہوتا۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اس قدر خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ساتھی بہت جلد تم تک پہنچنے والے ہیں۔"

"وہ کیسے؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"ہمارے گھر جو چار آدمی بھیجے گئے، وہ ان کے قبضے میں آ چکے ہوں گے، ان کی مدد سے وہ ہم تک پہنچ جائیں گے۔" فاروق نے کہا۔

"تم دونوں شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ اوّل تو یہ کہ یہ وہ جگہ نہیں جہاں تم بے ہوش ہوئے تھے۔ مطلب یہ کہ تم جنگل والی عمارت میں نہیں ہو۔ بلکہ اس جگہ سے بہت فاصلے پر ایک دوسری عمارت میں ہو اور یہ عمارت ایک ایسی جگہ پر موجود ہے۔ جہاں کسی کا خیال تک نہیں جا سکتا۔"

"تب بھی وہ پہنچ جائیں گے۔ آپ کرتے کیا ہیں؟" فاروق نے سرسری انداز میں کہا۔

"بہت کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہ کر وہ آگے بڑھا۔ اس کا پاؤں حرکت میں آیا اور ٹھوکر فاروق کے سر پر لگی۔ فاروق چلّا اُٹھا:

"یہ کیا کیا ظالم۔" ساتھ ہی اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں

سے تھام لیا:

اُسی وقت ایک ٹھوکر محمود کے سر پر لگی۔ محمود بھی چلّا اُٹھا:

"آپ۔ آپ پاگل تو نہیں ہیں۔"

"ہاں! میں پاگل ہوں اور اب تمھیں پاگل کر کے چھوڑوں گا۔ سُنو۔ انسپکٹر جمشید یہاں تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" فاروق چیخا۔

"یہ۔" یہ کہ کر اس نے اس کے سر پر ایک ٹھوکر اور رسید کی۔ فاروق کا سر زور سے چکرایا، آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا، پھر ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

"یہ۔ تم نے کیا کیا؟" محمود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ ابھی تو میں تمھارے ساتھ بھی یہی کروں گا۔ اور تم دونوں کے ہوش میں آنے پر ایک اور نظارہ دکھاؤں گا۔ ایسا نظارہ۔ کہ تم دیکھ نہ سکو گے، لیکن دیکھنے پر مجبور ہو گے۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے سر پر بھی ایک اور بھرپور ٹھوکر لگی۔ اور وہ ان دیکھی گہرائیوں میں گرتا چلا گیا۔ عین اُسی وقت قدموں کی آواز گونجی۔ لمبے قد والا دروازے کی طرف مُڑا۔

مجرموں کے ساتھی کے سر پر دے مارا۔ وہ لڑھک گیا۔ جب یہ اطمینان
ہوگیا کہ وہ بے ہوش ہوگیا، تو وہ آگے بڑھے۔

"ہمیں درختوں کی اوٹ لے کر عمارت تک پہنچنا ہے۔" انسپکٹر
جمشید بولے۔

"جی بہتر!" فرزانہ بولی، پھر اس نے چونک کر کہا۔

"لیکن ابا جان۔ عمارت میں تو کوئی بھی نظر نہیں آتا۔"

"یہ اندازہ تم نے کس طرح لگا لیا؟"

"باہر کوئی گاڑی نہیں ہے، اتنی دور یہ لوگ پیدل تو
آ نہیں سکتے۔"

"اور دوسرے یہ کہ دروازہ بھی چوپٹ کھلا ہوا ہے۔"

"گاڑی تو وہ چاروں لے گئے ہوں گے جو ہم سے لفافہ
حاصل کرنے آئے تھے۔ انھوں نے اسے اِدھر اُدھر کھڑا کیا ہو
گا، اس لیے ہمیں گلی میں نظر نہیں آئی۔" پروفیسر داؤد نے خیال
ظاہر کیا۔

"ہوں ٹھیک ہے، لیکن دروازے کا چوپٹ کھلا ہونا فرزانہ
کے خیال کی تائید کر رہا ہے، خیر دیکھتے ہیں۔"

وہ دبے پاؤں دروازے میں داخل ہوئے۔ اور پھر
انھیں فوراً ہی احساس ہو گیا۔ عمارت میں کوئی شخص موجود
نہیں ہے۔ اب وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ مکان بھائیں بھائیں

کر رہا تھا۔ فرش پر بہت سے قدموں کے نشانات تھے۔
خون کے چند قطرات بھی نظر آئے۔ جو بالکل تازہ تھے:

"معلوم ہوتا ہے۔ یہاں جھڑپ ہوئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے
فرش کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ محمود اور فاروق کو کہیں
اور لے گئے۔" فرزانہ بولی۔

"گویا ہمیں ان کے دوسرے ٹھکانے کا پتا لگانا ہوگا۔"

"جمشید۔ وہ کیا چیز پڑی ہے۔" پروفیسر داؤد چلا اُٹھے۔
ساتھ ہی انھوں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ تینوں نے ایک ساتھ
اس طرف دیکھا۔ فرش پر کوئی سُرخ سے رنگ کی چیز پڑی تھی۔
وہ آگے بڑھے۔ دوسرا لمحہ حیران کن تھا۔

ان کے سامنے سونے کی ایک انگوٹھی پڑی تھی۔ نگ کی
جگہ سُرخ ہیرا جگ مگا رہا تھا، انسپکٹر جمشید نے اسے ایک کاغذ کے
ذریعے اُٹھا لیا، کیوں کہ اس پر انگلیوں کے نشانات ہو سکتے
تھے۔ چند لمحے تک اسے بغور دیکھتے رہنے کے بعد انسپکٹر جمشید
بڑبڑائے:

"ہمیں کسی جوہری کے پاس جانا ہوگا۔"

"لل۔ لیکن ابا جان۔ ہم تو محمود اور فاروق کی تلاش میں نکلے
ہیں۔" فرزانہ پریشان ہوگئی۔

" مجرم انھیں لے کر کہیں اور جا چکے ہیں۔ ہم اس جگہ تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے سوالیہ انداز میں کہا۔

" اس مجرم کے ذریعے۔ جو کار کے پاس بے ہوش پڑا ہے۔ انگوٹھی کے بارے میں تفتیش تو بعد میں بھی ہوتی رہے گی، نہ جانے محمود اور فاروق کس حال میں ہوں۔"

" ہوں۔ بات ٹھیک ہے۔"

" بات تو ٹھیک ہے۔ آؤ۔" انھوں نے جلدی سے کہا اور عمارت سے باہر نکل آئے۔ تیز تیز چلتے کار تک آئے اور پھر دھک سے رہ گئے۔

جس مجرم کو وہ پستول کے دستے سے بے ہوش کر کے ڈال گئے تھے۔ اب اس کے سر میں گولی کا سوراخ تھا اور وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔

" حیرت ہے۔ ہم نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

" بے آواز پستول استعمال کیا گیا ہو گا۔ وہ لوگ جاتے وقت اپنا کوئی ساتھی جنگل میں چھپا گئے تھے۔ اس نے ہم سب کو عمارت میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد وہ اس کے پاس آیا ہو گا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی ہو گی، لیکن یہ ہوش میں نہ آیا۔ ادھر اسے خطرہ محسوس ہوا کہ زیادہ دیر ٹھہرا تو کہیں ہم اسے نہ دیکھ لیں؛ چنانچہ اس نے یہی مناسب

خیال کیا۔ کہ اسے ختم کر دے۔"

" اس کا مطلب ہے، اب ہم اس کے ذریعے ان کے دوسرے ٹھکانے تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

" ہاں! لیکن ہمارے پاس ہیرے کی انگوٹھی ہے۔ انگوٹھی کسی پتلے دُبلے آدمی کی ہے۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پینے کا عادی ہے۔"

" جی۔ یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔" فرزانہ نے چونک کر کہا۔

" انگوٹھی کا حلقہ زیادہ بڑا نہیں، پھر بھی وہ گری پڑی ملی ہے، یعنی اس شخص کی انگلی سے نکل کر گر گئی۔ اس کا مطلب ہے، وہ ضرور پتلا دُبلا آدمی ہے۔ دوسرے ہیرے کا سونا سیاہی مائل ہے۔ اور ایسا سگریٹ کے دھوئیں سے ہی ہوا ہو گا۔"

" ہوں۔ واقعی جمشید۔ تمھارا جواب نہیں۔ ایک انگوٹھی سے کتنے اندازے لگا لیے۔" خان رحمان حیران ہو کر بولے۔

" ابھی کیا ہے۔ ابھی تو اس پر سے انگلیوں کے نشانات اٹھائے جائیں گے۔"

" ہوں۔ تو پھر۔ اب کیا پروگرام ہے جمشید؟"

" ہم شہر کے مشہور جوہری کے پاس چل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے، ہمیں اور بھی جوہریوں کے پاس جانا پڑے۔ آخر ہمیں اس انگوٹھی کے مالک کو تلاش کرنا ہے۔ ویسے اس کا نام اور پتا معلوم ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی، کیوں کہ ہیرے کی انگوٹھیاں

بہت کم لوگ پہننے کی ہمت کرتے ہیں - اور پھر اس شخص کے پاس تو دولت کی یوں بھی بہت زیادتی معلوم ہوتی ہے - جسے اتنی بھی پروا نہیں کہ انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈھیلی ہے - گر سکتی ہے۔"

"تو پھر چلیے ابا جان - اب میں محمود اور فاروق کی طرف سے بہت پریشانی محسوس کر رہی ہوں۔" فرزانہ جلدی سے بولی۔

وہ کار میں بیٹھے، خان رحمان نے اسے سٹارٹ کرنے کی کوشش کی، لیکن کار ٹرٹرا کے رہ گئی -

"اوہو - اسے کیا ہوا؟" وہ بولے۔

"کہیں وہی تو ہاتھ نہیں دکھا گیا۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔

خان رحمان فوراً نیچے اترے - بونٹ اٹھاتے ہی وہ چونک اٹھے :

"اوہو - یہاں تو کئی تار الگ الگ ہوئے پڑے ہیں۔"

"کیا!" ان کے منہ سے نکلا۔

"خیر فکر نہ کریں - میں یہ تار جوڑنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔"

خان رحمان اور انسپکٹر جمشید انجن پر جھک گئے اور جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگے -

"معلوم ہوتا ہے، اس مرتبہ کسی بہت ہی گھاگ مجرم سے واسطہ آ پڑا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"گھاگ سے بھی دو ہاتھ آگے کہو فرزانہ۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"جی بہتر!" فرزانہ نے فوراً کہا۔

دس منٹ کی بھرپور کوشش کے بعد وہ کار درست کر سکے اور پھر روانہ ہوئے :

"یہ حرکت اس نے فرار ہونے کی مہلت حاصل کرنے کے لیے کی - اب تک وہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوگا۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! وہ ہمارے سارے راستے بند کر دینا چاہتا ہے - شاید ہم سے بہت خوف زدہ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اسی لیے محمود اور فاروق کو لے کر غائب ہو گیا ہے۔"

"ارے - ان تینوں کو تو ہم بھول ہی گئے - ہم ان کے ذریعے بھی تو مجرموں کے ٹھکانے تک جا سکتے ہیں۔" پروفیسر داؤد چونک کر بولے۔

"دھت تیرے کی۔" فرزانہ نے تیز آواز میں کہا۔

"واقعی آج کا دن بھولنے کا دن ہے، کیوں کہ میں ایک اور ضروری بات پوچھنا بھول گیا ہوں۔" انسپکٹر جمشید شوخ آواز میں بولے۔

"جی - اور کیا بھول گئے ہیں۔"

"اس لفافے کے اندر کیا لکھا تھا؟"

"اوہ ہاں - یہ تو میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں - لفافے کے اندر سے نکلنے والے کاغذ پر صرف یہ الفاظ تھے - ٹاموتیئس بیس نو ہزار۔"

"ٹاموتیئس بیس - نو ہزار۔" انسپکٹر جمشید حیرت زدہ انداز میں بولے -

"جی ہاں۔ بس یہی الفاظ تھے" فرزانہ نے کہا۔

"ٹامو۔ تیئس۔ بیس۔ نو ہزار" انسپکٹر جمشید نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے۔ اچانک ان کی آنکھوں میں تیز چمک نمودار ہوئی۔ فرزانہ بے تابانہ انداز میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس چمک کو دیکھ کر بول اُٹھی:

"کیا آپ اس سے کچھ سمجھ گئے ہیں ابا جان؟"

"ہاں فرزانہ۔ میں کسی حد تک اندازہ لگانے میں ضرور کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ ٹامو ایک جگہ کا نام ہے۔ ایک ویران ساحل کا۔"

"کیا!" ان کے مُنہ سے ایک ساتھ نکلا۔

اوہ!

ایک ٹھنگ منگ سا آدمی کمرے میں داخل ہوا، اس پر نظر پڑتے ہی لمبا آدمی بولا:

"انگوٹھی لے آئے رابو؟"

"نہیں باس۔ مجھے افسوس ہے۔"

"کیا مطلب؟" لمبے آدمی نے چونک کر کہا۔

"میں جب وہاں پہنچا۔ تو انسپکٹر جمشید اپنی بیٹی اور دوستوں کے ساتھ مکان کے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے درختوں کی اوٹ سے انہیں اندر جاتے دیکھا۔ صاف ظاہر ہے۔ اس وقت میں کس طرح مکان کے اندر داخل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ کار میں جالی کو بھی لائے تھے۔ جالی کے سر پر پستول کا دستہ مار کر بے ہوش کیا گیا اور پھر وہ اندر داخل ہوئے۔"

"اور تم یہ منظر دیکھ کر چلے آئے۔" باس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"نہیں باس۔ آپ کا یہ خادم اتنا بے وقوف نہیں۔ اگر آپ
مجھ پر اتنا اعتماد کرتے ہیں تو میں بھی اس اعتماد پر پورا
اُترنے کی کوشش میں رہتا ہوں۔ میں نے جالی کو بے آواز
پستول سے ہلاک کر دیا اور ان کی کار میں گڑبڑ کر کے وہاں
سے روانہ ہو گیا۔ انگوٹھی کے بارے میں البتہ میں کچھ نہیں کر سکا۔"
"ہوں۔ ٹھیک ہے رابو۔ لیکن انگوٹھی حاصل کرنا بہت
ضروری ہے۔ ورنہ انسپکٹر جمشید مجھ تک پہنچ گیا۔ اور اگر وہ مجھ
تک پہنچ گیا تو پھر تم لوگ بھی بے کار ہو کر رہ جاؤ گے اور بھوکوں
مرو گے۔"
"پھر۔ آپ کا کیا حکم ہے باس؟" رابو نے پریشان ہو کر
کہا۔
"ہو سکتا ہے۔ انگوٹھی کسی ایسی جگہ گری ہو جہاں ان لوگوں
کی نظر نہ پڑی ہو۔ اس لیے تم پھر جاؤ اور انگوٹھی تلاش کرو۔"
"ان تینوں کا تو کوئی انتظام کرنے کی ضرورت نہیں جو انسپکٹر جمشید
کے قبضے میں ہیں؟" رابو نے پوچھا۔
"نہیں۔ وہ ہمارے لیے نقصان دہ نہیں ہیں۔ اس ٹھکانے
سے صرف جالی واقف ہے یا تم۔ اور میرے کچھ خاص آدمی۔"
"تو پھر میں انگوٹھی کی تلاش میں چلتا ہوں۔"
اسی وقت محمود نے کروٹ بدلی اور زور سے کراہا:

"ان دونوں کو کیا ہوا؟"
"بس۔ ذرا میں نے ان کے سروں کو فٹ بال سمجھ لیا تھا۔"
"اوہ!" وہ ہنس پڑا اور باہر نکل گیا۔ ابھی اسے گئے ایک
منٹ ہی ہوا تھا کہ پھر قدموں کی آواز سنائی دی۔ لمبے آدمی
نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ رابو چہرے پر الجھن
لیے کھڑا تھا۔
"کیوں رابو۔ کیا بات ہے؟"
"باس! ہو سکتا ہے، وہ انگوٹھی انسپکٹر جمشید کے ہاتھ لگ
گئی ہو۔ اس صورت میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟"
"کچھ نہیں۔ اس صورت میں اس سے اُلجھنے کی ضرورت
نہیں۔ ہمارا پلّہ بہت بھاری ہے۔ اس کے دو بیٹے میرے
قبضے میں ہیں۔ وہ میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔"
"کہیں آپ انسپکٹر جمشید کو سمجھنے میں غلطی تو نہیں کر رہے باس؟"
"بے وقوف نہ بنو رابو۔ باپ کو اولاد سے زیادہ پیاری
کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اگر وہ کسی طرح مجھ تک پہنچ گیا، تو
میں اسے بتا دوں گا کہ میری گرفتاری کی صورت میں اس کے
بیٹے اسے زندہ نہیں مل سکیں گے۔"
"جیسے آپ کی رائے باس۔ ویسے میں نے سنا ہے اور شاید
آپ نے بھی سنا ہو گا کہ انسپکٹر جمشید اپنے دین، ملک اور قوم

کے مقابلے میں اپنی اولاد کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"یہ سب زبانی باتیں ہیں رابو۔ اسے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اس کے دونوں بیٹے میرے قبضے میں ہیں۔ لہٰذا وہ مجھ تک پہنچنے کے لیے بُری طرح بے چین ہوگا۔ پہنچ بھی گیا تو اس کے بیٹے کہیں اور ہوں گے اور میں کہیں اور۔" یہ کہتے وقت اس کے چہرے پر ایک شیطانی مُسکراہٹ رینگ گئی۔

"اوکے باس۔ میں آپ کی عقل کو نہیں پہنچ سکتا۔" رابو نے بے چارگی کے عالم میں کہا۔

"بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تم نے۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"لیکن اس کے باوجود میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ان دونوں کو فوری طور پر اس جگہ بھجوا دیں جہاں بھجوانے کا ارادہ ہے۔"

"ہاں! تمھارا یہ مشورہ پسند آیا۔ شکریہ۔ میں ابھی یہ کام کرتا ہوں۔" اس نے مُسکرا کر کہا۔

رابو ایڑیوں پر گھوما اور باہر نکل گیا۔ ساتھ ہی باس نے زور سے تالی بجائی۔ چار لمبے تڑنگے آدمی کمرے میں داخل ہوئے:

"کیا حکم ہے باس؟"

"ان دونوں کو ٹھکانا نمبر نو میں پہنچا دو۔"

"اوکے باس۔"

"اور تم چاروں وہیں موجود رہو۔ دیکھو۔ یہ بہت چالاک ہیں۔ ہوش میں آنے پر کہیں تم لوگوں کو جُل نہ دے جائیں۔"

"فکر نہ کریں باس۔ ہم پوری طرح چوکس رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم انھیں ویگن کے پچھلے حصّے میں ڈال کر لے جاؤ۔"

"اوکے باس۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا اور دونوں کو اُٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا، پھر ایک فریم کے پیچھے کوئی چیز گھمائی۔ فوراً ہی آتش دان میں ایک خلا نمودار ہوا اور سیڑھیاں نظر آئیں۔ وہ ان سیڑھیوں پر اُترتا چلا گیا۔ جوں ہی اس کا سر غائب ہوا۔ خلا غائب ہوگیا، آتش دان اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

"توٹاموا ایک ویران ساحل کا نام ہے۔" فرزانہ نے پُرجوش انداز میں کہا۔

"ہاں۔ سنا ہے، ان اطراف میں بھٹکتی رُوحیں دیکھی گئی ہیں۔ لوگ دن کے اوقات میں بھی ادھر کا رُخ کرنے سے گھبراتے

ہیں۔ رُوحوں کی آوازیں بھی لوگوں کو سنائی دیتی ہیں۔ روتی ہوئی رُوحیں، ہنستی ہوئی رُوحیں اور چیختی چلاتی رُوحیں۔"

"ہوں! تو کیا آپ کے خیال میں وہاں واقعی رُوحیں پھرتی رہتی ہیں۔"

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ مسکرائے۔

"پھر اب کیا پروگرام ہے؟"

"سب سے پہلے جوہری سے ملیں گے۔ کم از کم اس انگوٹھی کے مالک کا نام تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک۔ تو پھر چلیے۔" فرزانہ بولی۔

"خان رحمان۔ تم اور پروفیسر صاحب۔ اگر جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔"

"جا کس طرح سکتے ہیں۔ یہ محمود اور فاروق کی گم شدگی کا معاملہ ہے۔"

"نہیں۔ صرف ان کی گم شدگی کا معاملہ نہیں۔ دو انسان بھی ہلاک کیے جا چکے ہیں۔ نواز جان اور روفی چاٹ والا۔" انھوں نے کہا۔

"اس لحاظ سے تو ہمیں بالکل نہیں جانا چاہیے۔"

"تو پھر آئیے۔ ذرا جوہری صاحب سے ملاقات ہو جائے۔"

جلد ہی ان کی کار جیولری کی ایک بہت بڑی دکان کے

سامنے رُکی:

"یہ ہمارے شہر کے سب سے بڑے جوہری ہیں۔ راجا بھیک۔"

"راجا بھیک۔ یہ کیا نام ہوا۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"نام واقعی عجیب ہے۔ خیر آؤ، ہمیں کیا۔" انسپکٹر جمشید نے مُنہ بنایا اور گھومنے والا دروازہ پار کر گئے۔ وہ بھی ان کے پیچھے اندر چلے۔ آخر انھیں ایک چھوٹے سے کمرے تک لے جایا گیا، آبنوس کی بنی ہوئی ایک میز کے دوسری طرف قیمتی کپڑوں میں ملبوس ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے سر کے بال نصف کے قریب سفید تھے۔ ہاتھ میں ایک موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔

"تشریف لائیے جناب۔ میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" اس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب!" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ مطلب کس بات کا پوچھ رہے ہیں جناب۔ میں نے تو صرف اپنا نام بتایا ہے۔"

"اوہ معاف کیجیے گا۔ دراصل حیرت اس لیے ہوئی ہے کہ آپ تو بہت مشہور و معروف ہستی ہیں۔"

"چلیے خیر کوئی بات نہیں۔ میں آپ کی خدمت میں ایک انگوٹھی پیش کر رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر اسے ہاتھ نہ لگائیے

گا۔"

"جی کیا مطلب؟" اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔

"اس پر کسی مجرم کی انگلیوں کے نشانات ہو سکتے ہیں۔"

یہ کہ کر انھوں نے پڑیا کو کھول دیا۔ راجا بھیک کی نظریں انگوٹھی پر جم گئیں۔

"کیا آپ اس انگوٹھی کو پہچانتے ہیں؟"

"جی ہاں! بہت اچھی طرح، لیکن جناب بات کیا ہے؟"

"بات بھی آپ کو بتا دی جائے گی۔ پہلے تو یہ بتائیں۔ کیا یہ آپ کے ہاں سے فروخت کی گئی تھی؟"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اسے کس طرح پہچانتا۔"

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ یہ آپ سے کس نے خریدی تھی۔ کس تاریخ کو خریدی تھی۔ مہربانی فرما کر پورا ریکارڈ منگوا لیں۔"

"فکر نہ کریں۔" یہ کہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔

فوراً ہی ایک ملازم اندر داخل ہوا:

"رجسٹر نمبر تین لے آؤ۔"

"جی بہتر۔" اس نے کہا اور چلا گیا۔

"ہیرے کی انگوٹھیاں پہننے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، اس لیے انھیں یاد رکھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اوہو۔ یہ آپ کے ساتھ خان رحمان صاحب تو نہیں ہیں۔" اس نے چونک کر کہا۔

"آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔" خان رحمان بولے۔

"حیرت ہے۔ آپ کی انگلی میں کوئی انگوٹھی۔ جب کہ میری معلومات کے مطابق آپ ایک سونے کی کان کے مالک ہیں۔ اور اس میں سے برابر سونا نکل رہا ہے۔"

"آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔ لیکن افسوس میں اپنی انگلی میں سونے کی انگوٹھی نہیں پہن سکتا۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"اس لیے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو سونا چاندی پہننا منع فرمایا ہے۔"

"آپ کا مطلب اپنے نبی سے ہے۔" اس نے قدرے منہ بنا کر کہا۔

"کیوں۔ کیا آپ انھیں نبی نہیں مانتے؟" پروفیسر داؤد نے اسے گھورا۔

"یہ مطلب نہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"ہاں جناب۔ میرا مطلب یہی ہے۔" انسپکٹر جمشید بول پڑے۔

"خیر۔ کوئی بات نہیں۔ میں تو ان کی انگلیاں خالی دیکھ کر کہ بیٹھا تھا۔ آپ برا نہ محسوس کیجیے گا۔"

"چلیے۔ نہیں کریں گے۔"

اسی وقت ملازم اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا رجسٹر تھا۔ راجا بھیک رجسٹر کے ورق اُلٹنے لگا۔ آخر ایک صفحے پر رُک کر اس نے کہا:

"انگوٹھی آج سے چھے ماہ پہلے خریدی گئی تھی۔ خریدار کا نام احسان دلاوری ہے۔ ۱۱۰ کیوبک روڈ پر رہتے ہیں۔ بہت بڑے ساہوکار ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" انھوں نے نام پتا ذہن نشین کیا اور دکان سے باہر نکل آئے۔

"کیوں نہ پہلے اس پر سے نشانات اُٹھوا لیں۔ تاکہ ان کی حفاظت کے چکر میں نہ پڑے رہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جیسے آپ کی مرضی۔ میں تو جلد از جلد محمود اور فاروق تک پہنچ جانا چاہتی ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" وہ بولے۔

نشانات محفوظ کرانے کے بعد انھوں نے اکرام کو فون کیا:

"ہاں بھئی۔ خنجر پر پائے جانے والے دوسرے نشان کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

"جی ہاں جناب۔ وہ نشان آسوپاری کا ہے۔ چوریوں اور ڈکیتیوں کے جرم میں کئی بار کا سزا یافتہ ہے، ان دنوں باہر ہے، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا ٹھکانا آج کل کہاں ہے۔"

"گھر کا پتا تو معلوم ہوگا۔"

"گھر میں تو بوڑھی ماں کے سوا کوئی بھی نہیں ہوتا۔ اور وہ بھی اندھی ہے۔"

"پتا۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"گلابو بستی مکان نمبر دو سو تین۔" اکرام نے کہا اور انھوں نے یہ نام اور پتا نوٹ کر لیا، پھر شکریہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

وہ کیوبک روڈ پہنچے، احسان دلاوری کے ملازم نے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ جلد ہی ایک سڈول جسم کا لمبے قد والا آدمی اندر داخل ہوا:

"مجھے احسان دلاوری کہتے ہیں۔ میں حیران ہوں۔ آپ حضرات کا میرے گھر میں کیا کام؟"

"ہم ایک ہیرے کی انگوٹھی کے سلسلے میں آپ سے ملنے آئے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہیرے کی انگوٹھی۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں! ملاحظہ فرمائیے۔" انھوں نے کہا اور انگوٹھی جیب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔

"یہ۔ یہ تو میری انگوٹھی ہے۔" اس نے کہا اور فوراً اُٹھا کر اپنی انگلی میں پہن لی، پھر اسے انگلی میں گھما کر دیکھتے ہوئے بولا:

"بہت بہت شکریہ۔ آپ کو کہاں سے مل گئی؟"

"تو کیا یہ آپ کے پاس سے گم ہو گئی تھی؟"

"ہاں۔ یہی بات ہے۔"

"کیوں۔ کیا یہ آپ کی انگلی میں ڈھیلی ہے؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ یہ بالکل فٹ ہے۔ اور اسی بات پر مجھے آج تک حیرت ہے کہ یہ کیسے گر گئی تھی۔ یا گم ہو گئی تھی۔"

"ذرا تفصیل سے بتائیے۔ یہ کس طرح گم ہوئی تھی۔" انسپکٹر جمشید نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

"مجھے نہیں یاد۔ میں اسے ہر وقت پہنے رہتا تھا۔ بس ایک صبح سو کر اُٹھا تو یہ انگلی میں نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سویا تھا، کمرے میں داخل ہونے کا اور کوئی راستا بھی نہیں ہے۔ کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہیں۔ ان حالات میں انگوٹھی کا غائب ہونا ایک چکرا دینے والی بات تھی اور میں بہت دنوں تک چکراتا بھی رہا تھا۔"

"تو کیا رات کو سوتے وقت انگوٹھی آپ کی انگلی میں تھی؟" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"جی ہاں۔ بالکل۔"

"کیا آپ کو بہت اچھی طرح یاد ہے؟"

"بہت اچھی طرح۔ رات کو میں دیر تک جاگتے رہنے کا عادی ہوں۔ بلب بُجھا کر اس ہیرے کی چمک کو دیکھتے رہنا

میرا مشغلہ بن گیا تھا۔ اس رات بھی میں اسے دیکھتا رہا۔ اس لیے مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

"اوہ! تب تو یہ ایک بہت زیادہ حیرت انگیز مسئلہ ہے، آپ خود فرمائیں۔ اس طرح انگوٹھی کہاں جا سکتی ہے؟"

"میں تو خود آج تک حیران ہوں۔"

"اور کیا آپ نے اس کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی؟"

"ہاں بالکل۔ کئی بار انسپکٹر سے پوچھ بھی چکا ہوں کہ انگوٹھی کا کچھ پتا چلا یا نہیں، لیکن وُہ اس سلسلے میں کچھ بھی کام نہیں دکھا سکے۔ حیران ہوں۔ آپ کے ہاتھ یہ کس طرح لگ گئی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جناب، پھر آ کر سُناؤں گا، اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ یہ انگوٹھی بھی فی الحال میرے پاس رہے گی۔"

یہ کہ کر اُنھوں نے انگوٹھی اُٹھا لی اور اُٹھ کھڑے ہوئے، احسان دلاوری انھیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب وُہ گلابو بستی پہنچے مکان نمبر دو سو تین کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک بوڑھی عورت نے کھولا:

"کون ہے؟"

"بڑی اماں۔ ہمیں آپ کے بیٹے آسو پاری سے ملنا ہے۔"

"وہ موا یہاں کہاں۔ مرجائے اللہ کرکے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلاکر اپنے سینے پر مارے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آخر وہ آپ کا بیٹا ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اوہو۔ لڑکی کی آواز۔ آپ کے ساتھ آپ کی بیٹی ہے شاید۔"

"جی ہاں۔ یہی بات ہے۔"

"وہ مردود میرے لیے پہلے ہی مرچکا ہے۔ اس نے ماں کی کبھی خبر نہیں لی۔ حالاں کہ میں اندھی ہوں۔ محلے کے لوگ میری مدد کردیتے ہیں اور اس طرح میں دو وقت کی روٹی کھاتی ہوں۔"

"بہت افسوس ہوا۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے جیب سے کچھ کرنسی نوٹ نکالے اور اس کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

"یہ۔ یہ کیا؟" وہ ہکلائی۔

"یہ کچھ پیسے ہیں بڑی اماں۔ آپ کے کام آجائیں گے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اللہ تمھارا بھلا کرے۔"

اب خان رحمان نے جیب میں سے نوٹ نکالے اور

اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"یہ۔ یہ کیا؟" وہ ہکلائی، اس وقت تک پروفیسر داؤد بھی کچھ نوٹ اسے دے چکے تھے۔

"یہ۔ یہ۔ یہ۔"

اور آخر میں فرزانہ نے اپنی جیب خالی کردی۔ اندھی اور بوڑھی عورت کو ہکا بکا چھوڑ کر وہ واپس مڑے اور کار تک آئے۔

"کامیابی ابھی تک ہم سے بہت دور ہے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"جب کہ میرا خیال ہے، ہم بہت تیزی سے کامیابی کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ۔ وہ کیسے جمشید۔" خان رحمان نے حیران ہوکر کہا۔

"ٹامو۔ کا مطلب میں جانتا ہوں۔ یہ ایک ویران ساحل کا نام ہے۔ ٹامو سے آگے الفاظ ہیں۔ تیئس بیس۔ بھلا اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟"

"وہاں کوئی عمارت ہوگی۔ یہ اس کا نمبر ہے۔ تیئس بیس کا مطلب ہے دو ہزار تین سو بیس۔" پروفیسر داؤد نے فوراً کہا۔

"خان رحمان - تمہارا کیا خیال ہے؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بالکل وُہی - جو پروفیسر صاحب کا ہے۔" انھوں نے فوراً کہا۔

"اور فرزانہ تم کیا کہتی ہو؟"

"م - میں ابھی تک اندازہ نہیں لگا سکی - کیا اس ساحل پر کچھ عمارات ہیں؟"

"نہیں - یہی تو مُشکل ہے - وہاں دُور دُور تک کوئی عمارت نہیں ہے - چٹانیں ضرور ہیں۔"

"ارے - پھر تو ہمارا خیال غلط ہو گیا۔" خان رحمان نے گھبرا کر کہا۔

"خان رحمان - تم مجھے بھی لے ڈوبے۔" پروفیسر داؤد نے مُنہ بنایا۔

"تو میں نے کب آپ سے کہا تھا کہ میرے خیال کی تائید کر دیں۔"

"اب کبھی تمھارے کسی خیال کی تائید نہیں کروں گا۔"

"م - مجھے - محمود اور فارُوق بے تحاشا یاد آ رہے ہیں۔"

"لیکن مُشکل یہ ہے کہ ابھی تیئس بیس میں بہت دیر ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کک - کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تیئس بیس کا مطلب ہے تیئس بج کر بیس منٹ - اور تیئس رات کے گیارہ بجے بجتے ہیں، گویا رات کے گیارہ بج کر بیس منٹ پر - ٹاموکے ساحل پر پہنچنا ہے - اب رہ گیا مسئلہ نو ہزار کا - یہ ہم وہاں چل کر معلوم کریں گے۔"

"اوہ!" ان کے مُنہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

ظالموں کے ظالم

چند لمحے کی خاموشی کے بعد انسپکٹر جمشید بولے:

"ہم نے اور تو سب کام کر لیے - اگر نہیں کیا تو ایک۔"

"اور وہ کیا؟" فرزانہ بولی۔

"روفی چاٹ والے کے گھر نہیں ہو کر آئے - ہمیں یہ بھی تو معلوم کرنا ہے کہ ان معاملات سے آخر اس کا کیا تعلق تھا۔"

"لیکن جمشید - کن معاملات سے ابھی تک تو ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔" خان رحمان نے منہ بنا کر کہا۔

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے - خیر میں بتاتا ہوں - دیکھو نا بھئی - چاٹ جو دوسروں کے لیے بنائی گئی تھی، وہ محمود اور فاروق اٹھا کر لے آئے - اس میں سے سفید لفافہ نکلا - کچھ لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی - انھوں نے پہلا کام تو یہ کیا کہ روفی کو گولی مار دی اور دوسرا یہ کیا کہ لفافہ حاصل کرنے کی کوشش کی - گویا وہ نہیں چاہتے تھے کہ پیغام ہمارے ہاتھ لگے - ادھر ارجمند اور

نواز جان روفی چاٹ کھانے کے عادی تھے - وہ بھی عجیب قسم کی گڑبڑ کا شکار ہو گئے، ان میں سے ایک قتل ہو گیا، دوسرا دماغی توازن کھو بیٹھا اور اس کے کمرے سے خون آلود خنجر بھی ملا جس سے نواز جان کو ہلاک کیا گیا تھا - گویا ایک طرح سے ان کا بھی کوئی تعلق روفی سے یا روفی چاٹ سے ہے - سوال یہ ہے کہ وہ تعلق کیا تھا - اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اس کے گھر جانا ہو گا - ٹھہرو میں متعلقہ تھانے سے اس کا پتا معلوم کرتا ہوں۔" یہ کہ کر انھوں نے ایک پبلک فون بوتھ سے فون کیا اور واپس آتے ہوئے بولے:

"فرزانہ، شاید تم یہ سن کر حیران ہو گی کہ روفی کیوبک روڈ پر رہتا تھا۔"

"جی - کیوبک روڈ پر - آپ کا مطلب ہے - جہاں مسٹر احسان ڈلاوری رہتے ہیں - جنھوں نے ہیرے کی انگوٹھی خریدی تھی۔" فرزانہ بے چینی کے عالم میں بولی۔

"ہاں! اس سے بھی زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کی کوٹھی کا نمبر ۱۰۸ ہے۔"

"اور احسان ڈلاوری کی کوٹھی کا نمبر ۱۱۰ ہے - گویا دونوں گھروں کے درمیان میں صرف ایک گھر ہے - تب تو جلدی کیجیے - یہ ضرور کوئی بہت گہرا معاملہ ہے۔"

وُہ کیوبک روڈ پہنچے۔ اور یہاں پہنچ کر انھیں معلوم ہوا ۔
۱۰۸ نمبر کی کوٹھی ۱۱۰ نمبر کوٹھی کے ایک کوٹھی بعد نہیں۔ بلکہ
اس کے بالکل پیچھے تھی اور دونوں کی دیواریں ملی ہوئی تھیں،
انھوں نے اس کے دروازے پر دستک دی ۔ اور فرزانہ
بول اُٹھی :

" اوہو۔ اس کے دروازے پر تو تالا لگا ہوا ہے۔"

" تب تو اسے کھولنا ہوگا۔ کیا روفی یہاں اکیلا رہتا تھا؟"
خان رحمان بڑبڑائے ۔

" یہ تو آس پاس کے لوگوں سے معلوم کرنا پڑے گا۔"

" تم اور فرزانہ معلوم کرو۔ میں تالا کھولتا ہوں۔ اب اتنا وقت
نہیں ہے کہ ہم وارنٹ لائیں۔" یہ کہہ کر انھوں نے تالا کھولنے
کی کوشش شروع کر دی۔ آخر دو منٹ کی کوشش کے بعد تالا
کُھل گیا ۔ دونوں ، فرزانہ اور خان رحمان کی واپسی کا انتظار کرنے
لگے۔ تین منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی۔

" پڑوسیوں کا بیان عجیب وغریب ہے۔" فرزانہ بولی۔

" چلو خیر۔ جیسا بھی ہے، سُننا تو پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید بے چارگی
کے عالم میں بولے ۔

" یہاں صرف روفی رہتا تھا ؛ البتہ اس کے ملنے والے مرد
حضرات اکثر آتے جاتے رہتے تھے ، بلکہ اس گھر کی چابیاں صرف روفی

کے پاس نہیں ، اس کے دوستوں کے پاس بھی رہتی ہیں۔ گویا تالا
لگا ہوا ہونے کی صورت میں بھی وُہ آ کر اندر بیٹھ جاتے ہیں۔"

" واقعی یہ ایک عجیب بات ہے ۔ روفی کا کردار بہت ہی
عجیب سا محسوس ہو رہا ہے ، کاش اسے گولی نہ ماری جاتی اور ہم
اس سے معلومات حاصل کر سکتے۔ آؤ۔ اندر سے اس کا جائزہ لے
لیں۔" انھوں نے کہا۔

وُہ اندر داخل ہوئے ، یہ ایک شان دار کوٹھی تھی ، لیکن اندر
سے بالکل خالی تھی ۔ ایک کمرے میں چند کرسیاں اور ایک میز ضرور
تھی ۔ میز پر جگ اور گلاس بھی رکھے تھے۔ اور ایک الماری میں
شراب کی بوتلیں موجود تھیں ۔

" وُہ مارا۔ ان گلاسوں پر ان کی انگلیوں کے نشانات موجود
ہیں۔" فرزانہ نے پرجوش انداز میں کہا۔

" ہاں۔ ٹھیک ہے۔ اس پوری کوٹھی سے انگلیوں کے نشانات
اُٹھانا ہوں گے اور ہر کمرے کا بغور جائزہ بھی لینا ہوگا۔ لہٰذا
خان رحمان تم ذرا اکرام کو فون کر دو۔"

ایک طرف تپائی پر فون بھی موجود تھا۔ لہٰذا اکرام کو فون
کر دیا گیا ۔

" شاید ان لوگوں نے یہ کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے ۔ فرزانہ
معلوم کرو۔ کوٹھی کس کی ہے۔"

"جی بہتر!"

فرزانہ گھر سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئی تو اس کے چہرے پر اُلجھن کے آثار تھے۔

"عجیب سی بات ہے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس کیس میں سبھی باتیں عجیب ہیں۔ بہر حال معلوم ہوا ہے کہ اس کوٹھی کا مالک روفی چاٹ والا تھا۔ تاہم اس نے اس میں کبھی اپنے گھر والوں کو لا کر نہیں رکھا۔ اور دُوسری مزے کی بات یہ کہ ۱۱۰ نمبر کی کوٹھی بھی اسی کی ہے۔ اس نے یہ دونوں کوٹھیاں ایک ہی وقت میں بنوائی تھیں۔"

"اوہو اچھا۔"

انسپکٹر جمشید کے مُنہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا:

"جی ہاں۔ اب آئیے۔ کوٹھی کا جائزہ لیں۔"

انھوں نے ایک ایک کمرے کو دیکھنا شروع کیا، پھر چھت پر بھی آئے۔ دونوں کوٹھیوں کی چھتیں بھی آپس میں ملی ہوئی تھیں، درمیان میں صرف ایک منڈیر تھی جسے آسانی سے عبور کیا جا سکتا تھا۔ فرزانہ اچکی اور احسان دلاوری کی چھت پر کود گئی۔ پھر کچھ کہے بغیر پوری چھت کا ایک چکر لگایا۔ آخر زینے کی طرف بڑھی اور دبے پاؤں سیڑھیاں اُترنے لگی۔ انسپکٹر جمشید نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر وہ کوٹھی کے صحن میں

پہنچ گئی۔ عین اسی وقت ایک کمرے سے احسان دلاوری نکل کر صحن میں آگئے اور اسے دیکھ کر اُچھل پڑے:

"آ۔ آپ۔ آپ اندر کیسے آگئیں؟"

"جی۔ چھت کے راستے۔" فرزانہ مُسکرائی۔

"اور۔ اور چھت پر کس طرح پہنچیں؟" اس نے پوچھا۔

"روفی صاحب کے گھر کے ذریعے۔"

"لیکن کیوں! اس کی کیا ضرورت تھی؟" احسان دلاوری نے مُنہ بنا کر کہا۔

"ہم جائزہ لے رہے ہیں، آپ کی انگوٹھی بند کمرے سے کس طرح غائب ہو گئی۔ اور ہم کسی حد تک یہ راز جان چکے ہیں، بہت جلد آپ کو کچھ بتانے کے قابل ہوں گے۔" فرزانہ نے جلدی جلدی کہا۔

"اوہ!" احسان دلاوری کے مُنہ سے نکلا اور پھر فرزانہ واپس مُڑ گئی۔ چھت پر آ کر اس نے کہا:

"دونوں کوٹھیاں روفی چاٹ والے نے بنوائی تھیں۔ ان میں ضرور کوئی خفیہ راستا موجود ہے۔ جس کی مدد سے روفی یا اس کا کوئی ساتھی احسان دلاوری کے کمرے میں پہنچا اور انگوٹھی نکال لایا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اس نے ایسا کیوں کیا، اسے انگوٹھی کی کیا ضرورت تھی۔ کیا صرف قیمتی ہونے

کی وجہ سے یا پھر احسان دلاوری کو اغوا کے جرم میں پھنسوانے کے لیے۔" فرزانہ کہتی چلی گئی۔

"تم ٹھیک کہتی ہو فرزانہ۔ ہمیں وُہ راستا تلاش کرنا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید پُر جوش لہجے میں بولے۔

ایک بار پھر انھوں نے اس نئے خیال کے تحت کمروں کو دیکھا بھالا اور آخر ایک فریم کے پیچھے انھیں ایک گول لٹو سا لگا نظر آیا، جوں ہی انھوں نے اسے گھمایا، آتش دان میں ایک راستا نمودار ہوگیا۔ اور سیڑھیاں نظر آنے لگیں۔ ان کے مُنہ حیرت سے کُھل گئے:

"ہوشیار۔ مُجرم تہ خانے میں بھی ہو سکتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید دبی آواز میں بولے۔ انھوں نے پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور نیچے اُترنے لگے۔ نیچے انھیں ایک کُھلا کمرہ نظر آیا۔ اس کے دائیں طرف ایک اور زینہ بنا ہوا تھا۔ وُہ اس پر چڑھے۔ آخری سیڑھی پر دیوار کے ساتھ ایک ویسا ہی لٹو لگا نظر آیا، اسے گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ انھوں نے دیکھا، وُہ آتش دان کے نیچے کھڑے تھے۔ اوپر چڑھے تو خود کو ایک سجے سجائے کمرے میں پایا۔ کمرہ خالی تھا۔ اسی وقت قدموں کی آواز اُبھری۔ اور پھر انھیں احسان دلاوری کی حیرت زدہ آواز سُنائی دی:

"ارے! یہ کیا؟"

ساتھ ہی وُہ اندر داخل ہوگئے۔

"یہی وُہ راستا ہے جناب۔ جس کے ذریعے آپ کی انگوٹھی اڑائی گئی۔ رونی صاحب والے حصے میں بھی ایک کمرے کے آتش دان سے ایسا راستا نکلتا ہے۔ یہ دونوں راستے ایک تہ خانے تک جاتے ہیں۔"

"اوہ!" اس کے مُنہ سے نکلا۔

"ابھی آپ یہ بات کسی کو نہ بتائیے گا۔ ہم ذرا اور کام کر لیں۔"

"جی۔ بہتر۔" اس نے کہا اور پھر وُہ نیچے اُتر گئے۔

اب انھوں نے اس کمرے کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ آخر دیوار میں ایک اینٹ کے برابر خانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے اوپر سفید کپڑا چپکایا گیا تھا۔ خانے کے اندر ہاتھ ڈالا تو لٹو ہاتھ سے ٹکرایا۔ اسے گھمایا تو دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوا۔ اور ایک لمبا راستا نظر آنے لگا۔ وُہ اس میں چلتے گئے۔ انھیں یُوں محسوس ہوا جیسے وُہ کسی سُرنگ میں چل رہے ہوں۔ آخر سُرنگ ختم ہوئی اور پھر سیڑھیاں نظر آئیں، لٹو کے ذریعے دروازہ کھولا گیا۔ سن گن لے کر وُہ کمرے میں آ گئے۔ کمرے کا دوسرا دروازہ بند نہیں تھا۔ مکان میں مکمل

خاموشی تھی۔ وہ باہر نکل آئے۔ ابھی تک کوئی آواز سنائی نہیں
دی تھی۔ انھوں نے دبے پاؤں چلتے ہوئے پورے مکان
کو دیکھ ڈالا۔ مکان میں کوئی نہیں تھا، البتہ ایک کمرے
کے آتش دان پر بالکل ویسا ہی ننھا سا بُت رکھا تھا جیسا
وُہ جنگل والی عمارت میں دیکھ چکے تھے۔ نیلے پتھر کا بُت۔
جس کو چادر اُڑھا رکھی تھی۔ اور جس کی آنکھوں پر سفید اور
سُرخ لہریے سے تھے۔

"وُہی بُت۔" انسپکٹر جمشید بڑ بڑائے۔

"اس کا مطلب ہے۔ یہ بُت کسی خاص اہمیت کا مالک
ہے۔" خان رحمان بولے۔

"ہاں۔ آؤ باہر نکل کر دیکھیں۔ مکان کس کا ہے۔"

"ابا جان! ہم نے ابھی اس مکان کا ڈرائنگ روم نہیں
دیکھا۔" فرزانہ بول اُٹھی۔

"اوہ ہاں۔ آؤ۔"

انسپکٹر جمشید ان کے ساتھ چلتے ڈرائنگ روم میں داخل
ہوئے اور پھر دھک سے رہ گئے، کیوں کہ اس ڈرائنگ روم میں
بھی ایک ننھا سا بُت موجود تھا۔

محمود اور فارُوق کو دُوسری مرتبہ ہوش آیا تو انھوں نے
خُود کو رسیوں سے جکڑا ہوا پایا۔ رسیاں کچھ اس قدر سختی سے
باندھی گئی تھیں کہ انھیں گوشت میں دھنستی محسوس ہو رہی تھیں،
دوسری طرف سر پھوڑے کی طرح دُکھ رہے تھے۔ ان پر ٹھوکریں
پوری بے دردی سے ماری گئی تھیں۔

"یہ۔ ہم کس مصیبت میں پھنس گئے۔" محمود نے بھرائی ہوئی
آواز میں کہا۔

"ہیرو بننے کے شوق میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔" فارُوق نے
مُنہ بنایا۔

اسی وقت بھاری قدموں کی آوازیں سُنائی دیں، ساتھ ہی باس
کی آواز اُبھری:

"لاؤ بھئی۔ آج کا کام جلدی ختم کرو۔ یہ نظارہ ان دونوں
کو بھی دکھانا ہے اور پھر ان کی بھی باری آنی ہے۔"

انھوں نے سر گھما کر دیکھا۔ باس چلا آ رہا تھا۔ اس کے
ساتھ دس آدمی اور تھے۔ اور جس جگہ وُہ بندھے پڑے تھے۔
وہیں دو بوریاں پڑی تھیں۔ ان میں کوئی جان دار چیزیں
تھیں۔ بوریوں کے مُنہ بندھے ہوئے تھے۔ دس میں سے دو
آدمی آگے بڑھے۔ اور بوریوں کے مُنہ کھول دیے۔ اب انھوں
نے بوریوں میں ہاتھ ڈال دیے۔ دُوسرا لمحہ سنسنی خیز ہی نہیں،

قیامت خیز تھا اور اس سے زیادہ ہولناک منظر محمود اور فاروق
نے شاید اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ بوریوں میں سے چھے
زندہ لڑکے نکال کر فرش پر لٹا دیے گئے۔ ان کے ہاتھ، پیر
اور منہ بندھے ہوئے تھے۔ تاہم وہ ہوش میں تھے۔ ان کی
آنکھوں میں خوف کا ایسا عالم تھا کہ محمود اور فاروق نے کیا کبھی
دیکھا ہوگا۔ لڑکے چھے اور آٹھ سال کی عمر کے تھے۔

"یہ کیا۔ کیا تم لوگ کسی بیگار کیمپ کے لیے کام کرتے
ہو؟" محمود چلا اٹھا۔

"نہیں۔ ہمارا کام اس سے ذرا مختلف ہے۔ چلو۔ ان میں سے
پہلے کو دیوتا کے سامنے لٹاؤ۔"

"تم۔ تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟" فاروق کانپ گیا۔

"ابھی دیکھ ہی لوگے۔"

ایک نے بے دردی سے ان میں سے ایک لڑکے کو اٹھایا،
وہ بری طرح کانپنے لگا۔ اس کے جسم کی ایک ایک بوٹی میں
تھرکن صاف نظر آ رہی تھی۔ لیکن بندھا ہونے کی وجہ سے نہ
وہ ہل جل سکتا تھا، نہ چیخ چلا سکتا تھا۔ اسے بت کے سامنے
چبوترے پر لٹا دیا گیا۔ اب دوسرا ساتھی آگے بڑھا۔ اس کے
ہاتھ میں ایک لمبا سا چھرا تھا۔ اس نے لڑکے کے منہ کو
پکڑا اور چھرا اس کی گردن کی طرف لے گیا۔ لڑکا بری

طرح پھڑپھڑایا۔

"رک جاؤ ظالم۔ یہ کیا کر رہے ہو۔ اللہ کے قہر سے ڈرو۔"
محمود پوری قوت سے چیخا۔

"کیا بکواس ہے۔ یہ ہمارا پیشہ ہے۔"

"کیا کہا۔ پیشہ۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں! ہم انسانی کھوپڑیوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ چند بیرونی
ممالک میں انسانی کھوپڑیوں کی بہت مانگ ہے۔ وہ لوگ ان پر
تجربات کرتے ہیں۔ ان میں سے دماغ حاصل کرتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔ کیا ایک انسانی جان تمہارے نزدیک
اس قدر سستی ہے۔ اُف اللہ۔" محمود رونے کے قریب ہوگیا۔

"زندگی میں پہلی اور آخری بار یہ منظر دیکھ رہے ہو۔
اس لیے گھبرا گئے ہو۔ آخری بار اس لیے کہ ان کے بعد تمہاری
بھی گردنیں اتاری جائیں گی۔"

"نن۔ نہیں۔" فاروق بوکھلا اٹھا۔

"تب پھر۔ ان سب سے پہلے ہماری گردنیں کاٹ لو۔ ہم یہ
منظر نہیں دیکھ سکتے۔ رک جاؤ۔ اللہ کے لیے رک جاؤ۔ یہ ظلم
کی انتہا ہے۔" محمود نے پوری قوت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، اگر تم یہ منظر دیکھنا پسند نہیں کرتے تو ہم
پہلے تمہارا کام کیے دیتے ہیں۔" باس نے ہنس کر کہا۔

اس کا ساتھی رُک گیا اور باس کی طرف سوالیہ نظروں
سے دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے، پہلے اسے ذبح کرو۔"

اس کے دو ساتھی آگے بڑھے اور محمود کو گھسیٹ کر چبوترے
تک لے گئے۔ پہلے لڑکے کو ایک طرف سرکا دیا گیا۔ اب محمود
کو بُت کے سامنے لٹا دیا گیا اور چھرے والا اس کا سر پکڑ
کر گردن پر جھکا۔ فارُوق تڑپ اُٹھا اور چلّایا:

"نن۔ نہیں۔ یہ بے عدلی ہے۔"

"کیا بکواس ہے۔ یہاں عدل کہاں۔"

"چھوٹے بھائی کے ہوتے بڑے بھائی کو نہیں مارا جا سکتا۔
ظالمو! پہلے مجھ پر ظلم ڈھاؤ۔ میں یہ منظر نہیں دیکھ سکتا۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔" باس نے جھنّا کر کہا۔

"اور میں کہتا ہوں۔ پہلے مجھے ذبح کرو۔"

"تم لوگ بھی عجیب ہو۔ پہلے جان دینے کے لیے بے تاب ہو
رہے ہو۔ جب کہ لوگ موت سے کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔"

"کوسوں دُور بھاگنے والے اور ہوں گے۔ ہم تو موت کو
گلے سے لگانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ تجربہ کر لو۔
ہمارے منہ سے آواز تک نہیں نکلے گی۔ ہم صبر کا مظاہرہ کرتے
ہوئے اپنے اللہ کے حضور پہنچ جائیں گے۔"

"چلو بھئی۔ یہ بھی کیا یاد رکھے گا۔ پہلے اسے جانے دو۔" باس
نے ہنس کر کہا۔

"باس۔ یہ ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔" ایک ساتھی نے
کہا۔

"لیکن یہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان کی مدد کے لیے یہاں
کوئی نہیں آئے گا۔ انسپکٹر جمشید سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم پھر اس
جگہ موجود ہو سکتے ہیں۔"

"بھئی تم ہمارے والد صاحب کے بارے میں غلط فہمی میں
مبتلا ہو۔" فارُوق مسکرایا۔

اسی وقت دو آدمیوں نے اسے پکڑ کر چبوترے کی طرف
گھسیٹنا شروع کیا۔ محمود یہ دیکھ کر چلّا اُٹھا:

"نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط ہے۔ ان لڑکوں سے
پہلے جان دینے کی پیش کش پہلے میں نے کی تھی، اس لیے پہلے
ذبح ہونے کا حق بھی میرا ہے۔"

"تم لوگ تو مجھے پاگل معلوم ہوتے ہو اور شاید مجھے بھی پاگل
کر دو گے۔ چلو بھئی۔ اب ان کی کسی بات پر دھیان نہ دو۔
اپنا کام کرو۔ ہمیں ابھی ان کے دھڑ بھی ٹھکانے لگانے ہیں۔"

چھرے نے ابھی فارُوق کی گردن کو چھوا ہی تھا کہ چھرے
والا چیخ مار کر اپنی کمر کی طرف اُلٹ گیا۔ گولی کی آواز نے ان

کے ہوش اڑا دیے ۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی :
"خبردار ۔ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے ۔ ہاتھ سروں سے بلند کر دو ۔ ورنہ ایک ایک بھون کر رکھ دیا جائے گا ۔ ویسے تم لوگوں کو بھون کر رکھ دینا بھی بہت بڑے ثواب کا کام ہے ، لیکن میں قانون کو ہاتھ میں نہیں لوں گا ۔ اگر تم نے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی ۔ تو پھر ضرور بھوننے کا کام کیا جائے گا ۔"

ابھی ان کے الفاظ ختم نہیں ہوئے تھے کہ باس نے بیرونی دروازے کی طرف بے تحاشا انداز میں دوڑ لگا دی ۔ جواب میں انسپکٹر جمشید نے کوئی فائر نہ کیا ۔ البتہ یک دم اس کے سامنے آ گئے ۔ وہ ان سے بری طرح ٹکرایا اور لڑکھڑا گیا ۔ سنبھلتے ہوئے اس نے دائیں ہاتھ کا مکا ان کی ناک پر مارا ، لیکن وہ فوراً جھک گئے ۔

"کوشش بے کار ہے مسٹر باس ۔" وہ گنگنائے ۔

جواب میں اس نے دوسرے ہاتھ کا مکا مارا ۔ انسپکٹر جمشید نے گھوم کر خود کو اس وار سے بچایا اور پھر بولے :
"نہیں بھئی ۔ تمہارا یہ ہولناک کھیل اب جاری نہیں رہ سکے گا ۔ اب تو جیل کی سلاخیں ہی تمہارا مقدر ہیں اور اس کے بعد عدالت جو فیصلہ دے ۔"

الفاظ ختم ہونے سے پہلے ہی ان کا بھرپور مکا اس کی

ناک پر لگا اور وہ الٹ گیا ۔ لیکن ابھی اس میں دم خم باقی تھے ۔ گرتے ہی اٹھا اور ان پر دونوں ہاتھوں کے مکے تان کر بڑھا ۔ انسپکٹر جمشید کے دائیں ہاتھ میں اگرچہ پستول تھا ، لیکن انھوں نے اس سے فائر کرنے کی کوشش نہیں کی :
"میں تمہیں زندہ ہی گرفتار کروں گا ۔ تمہارے مظالم کی داستان بہت طویل اور بھیانک ہے مسٹر رونی چاٹ والے ۔"
"جی ۔ کیا فرمایا ۔ رونی چاٹ والے ۔" محمود چلا اٹھا ۔
"ہاں ۔ یہ رونی ہے ۔"
"لیکن ابا جان ۔ رونی تو مارا جا چکا ہے ۔"
"ارے نہیں بھئی ۔ وہ تو اس کا ایک ادنیٰ ملازم تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ سب لوگ اسے رونی چاٹ والا ہی خیال کرتے تھے ۔"
"اوہ !" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا ۔
"کیوں ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔
اس نے دونوں مکوں سے وار کیا ۔ انسپکٹر جمشید نیچے بیٹھ گئے اور وہ منہ کے بل گرا ۔ ساتھ ہی ان کا پاؤں اس کی کمر پر زور سے لگا ۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی ، وہ سیدھا ہو گیا ، لیکن اٹھ نہ سکا ۔
"چلو اکرام ۔ ان سب کو گرفتار کر لو ۔"
اکرام اور اس کے ماتحت آگے بڑھ کر اپنا کام کرنے لگے ۔

" معاف کرنا بھئی ۔ مجھے ذرا یہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی ۔"

" لیکن ابا جان ۔ حیرت تو یہ ہے کہ آپ یہاں کس طرح پہنچ گئے اور آپ کو یہ بات کس طرح معلوم ہو گئی کہ یہ روفی چاٹ والا ہے ۔"

انسپکٹر جمشید نے انھیں پہلے تو احسان دلاوری کی ہیرے کی انگوٹھی کے بارے میں بتایا ، پھر روفی والی کوٹھی کے معائنے کا ذکر کیا ۔ اس طرح وُہ تیسرے گھر تک پہنچے ۔ دونوں گھروں میں بُت موجود تھے ۔ اس طرح ہمیں بُت کی اہمیت کا احساس ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ بُت والے اس ٹھکانے کو وقتی طور پر ضرور چھوڑ دیا گیا ہے ۔ لیکن یہ اس سے الگ نہیں رہ سکتے ۔ اس طرح میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا ۔ دوسرے یہ کہ اس گھر سے اُنگلیوں کے نشانات اُٹھوائے ۔ وُہ نشانات اس کاغذ پر پائے جانے والے نشانات سے مل گئے ۔ جو تم لوگوں کو چاٹ میں سے ملا تھا ۔ روفی کے اپنے گھر سے بھی یہی نشانات ملے ۔ تیسرے گھر میں نشانات بالکل تازہ تھے ۔ جب کہ روفی پہلے ہی مارا جا چکا تھا ۔ لہذا میں نے جان لیا کہ جو مارا گیا ہے ، وُہ صرف دکان پر بیٹھنے کی حد تک روفی تھا ۔ ورنہ اصلی روفی تو زندہ ہے اور یہ ساری کارروائی کر رہا ہے ۔"

" اُف توبہ ۔ کس قدر گھناؤنا کاروبار ہے ان کا ۔" پروفیسر داؤد

کانپ اُٹھے ۔

" لیکن روفی چاٹ کے سلسلے کے اشتہارات والی بات سمجھ میں نہیں آئی ۔"

" اس طرح یہ اس چاٹ کو حد درجے مشہور بنا دینے کے چکر میں تھے ۔ تاکہ وہاں ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جایا کریں اور اس ٹھٹھ میں سے ایک آدھ بچّہ اغوا کر لیا جایا کرے ، چاٹ میں پیغام کا معاملہ یہ تھا کہ اپنے ساتھیوں کو اس طرح ہدایات دی جاتی تھیں کہ کھوپڑیاں ۔ لے کر کہاں پہنچنا ہے ۔ اور فی کھوپڑی کتنے پیسے وصول کرنے ہیں ۔ ٹاموتیئس بیس نو ہزار کا مطلب یہ تھا کہ آج رات گیارہ بج کر بیس منٹ پر کھوپڑیاں لے کر ٹاموپہنچنا ہے ۔ اور مال لینے کے لیے آنے والوں سے نو ہزار روپے فی کھوپڑی وصول کرنے ہیں ۔"

" اُف مالک ۔ نو ہزار روپے کے بدلے میں ایک جیتا جاگتا بچّہ یہ لوگ ذبح کرتے رہے ہیں ۔" خان رحمان نے روتی آواز میں کہا ۔

" ہاں ۔ ان کا ضمیر بالکل مُردہ ہو چکا ہے ۔ ان تین بُتوں کی موجودگی میں میں یہ اندازہ بھی لگا سکتا ہوں کہ یہ شخص مسلمان نہیں ۔ ضرور ہندو ہے ۔ دیوی دیوتاؤں کے چرنوں

میں انسانوں کو بھینٹ چڑھانا۔ ان لوگوں کا ہی طریقہ رہا ہے، یہ اور بات ہے کہ اب اس بھینٹ نے تجارت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب رہ گیا ارجمند اور نواز جان کا مسئلہ — پروفیسر صاحب اور خان رحمان آپ دونوں اگر چاٹ نہ کھانے آتے اور لفافہ ہم تک نہ پہنچتا، تب بھی سرور راہی مجھے اس معاملے کی طرف متوجہ کر چکے تھے۔ بہرحال۔ ابھی تک ارجمند والے معاملے کی تہ تک میں نہیں پہنچ سکا۔ ارجمند سے ملاقات کرنے پر ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔ بظاہر معلوم یہ ہوتا ہے کہ پندرہ دن پہلے چاٹ کھانے کے دوران اس میں سے ایک لفافہ ارجمند کے ہاتھ لگ گیا۔ اور ایسا غلطی سے ہوا۔ اس نے لفافہ کھول کر پڑھ لیا — دوسرے دن، گھر سے نکلا تو اس نے نواز جان کو فون کر دیا کہ آج وہ کالج نہیں پہنچے گا۔ بلکہ وہ بھی کالج سے چھٹی کر کے اس کے پاس آ جائے۔ انھوں نے ملاقات کی کوئی جگہ مقرر کی۔ ادھر نواز جان کالج سے یہ کہہ کر نکلا کہ وہ اپنے دوست کی تلاش میں جا رہا ہے۔ دونوں نے ملاقات کی، ملاقات کی جگہ سے نکلے تو روفی کے آدمی ان کا تعاقب شروع کر چکے تھے۔ پھر نہ جانے کس طرح وہ جنگل میں پہنچ گئے۔ روفی کے آدمیوں نے انھیں گھیر لیا، لڑائی میں نواز جان مارا گیا —

ارجمند کو بھی مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا اور بے ہوشی کی حالت میں خنجر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور نواز جان کو گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ یہ کام ارجمند نے کیا ہے۔ ارجمند کو ہوش آیا تو دماغی حالت خراب تھی۔ اس نے یہ خیال کیا کہ اپنے دوست کو اس نے مارا ہے۔ چنانچہ وہ پاگلوں کی سی حالت میں گھر پہنچا اور خود کو گم صم بنا لیا۔"

"ہوں۔ ضرور یہی بات ہے۔ آپ کے اندازے کم ہی غلط ثابت ہوتے ہیں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

اکرام کے ساتھی ان سب کی رسیاں کھول چکے تھے اور وہ ہاتھوں پیروں کو جھٹک جھٹک کر خون کا دوران بحال کر رہے تھے۔

"اس کا مطلب ہے۔ اس کیس میں تم دونوں کوئی کام نہیں دکھا سکے۔" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ سراسر الزام ہے۔ یہاں ہم اگرچہ بندھی ہوئی حالت میں تھے، پھر بھی اپنی کوشش جاری رکھی اور اس کوشش کا یہ فائدہ ہوا کہ یہ بے چارے ذبح ہونے سے بچ گئے۔ اللہ جانے یہ ظالموں کے ظالم۔ اب تک کتنے بچے ذبح کر چکے ہوں گے۔"

"اللہ اپنا رحم فرمائے۔ خیر۔ ان لوگوں کو بھی بہت بھیانک سزا ملے گی۔ یہ سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔"

"یہ ایک ایسا دردناک کیس ہے کہ اس کے اختتام پر مسکرانے کو قطعاً جی نہیں چاہ رہا۔ نہ کوئی ایسا جملہ ادا کرنے کو جی چاہ رہا ہے جسے سن کر دوسرے مسکرا دیں۔ بلکہ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ چھ ماہ تک شاید کوئی مزاحیہ جملہ ادا نہ کر سکوں۔" فاروق نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ اور وہ اس کی تائید میں سر ہلانے پر مجبور ہو گئے۔

چاٹ کا چکر

کا انعامی سوال

سوال: پورے ناول میں سے ایک جملہ منتخب کریں۔ جن پانچ قارئین کا جملہ اشتیاق احمد کے منتخب کردہ جملے سے مل گیا، انعام کے حق دار ہوں گے۔

- ۲۵۰/- روپے کا انعام بذریعہ قرعہ اندازی پانچ برابر حصوں میں دیا جاتا ہے۔
- ہر سوال کا جواب بالکل الگ کاغذ پر لکھیں۔
- ہر کاغذ پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں۔
- کم از کم کاپی سائز کا کاغذ استعمال کریں، چھوٹے چھوٹے پرزے مقابلے میں شامل نہیں کیے جاتے۔

(ادارہ)

آیندہ ناول کی ایک جھلک

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران مرزا سیریز ۵۲

تیسری شیشی

مصنف: اشتیاق احمد

- انھیں ایک عجیب و غریب فون موصول ہوا —
- اتنا عجیب کہ انھیں فوراً روانہ ہونا پڑا —
- حالاں کہ انسپکٹر کامران مرزا اس وقت گھر میں موجود نہیں تھے اور فون بھی ان ہی کو کیا گیا تھا —
- اس مقام پر پہنچے تو ان پر کیا بیتی — آپ مسکرائے بغیر نہیں رہیں گے —
- ایک چکرا دینے والا کیس ان کا منتظر تھا —
- ان کے خیال میں تین آدمیوں میں سے ایک قاتل تھا، لیکن —
- حیرت اور سسپنس کا مرقع —

قیمت: چھے روپے

آیندہ ناول کی ایک جھلک

شوکی سیریز ۳۴

بڑا مجرم

مصنف: اشتیاق احمد

- مؤکل کے طور پر اس بار ان کے پاس جو ہستی آئی، عجیب تھی —
- وہ اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے — اس نے فیس بھی انوکھی پیش کی —
- اور جب وہ اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچے — تو ان پر بجلی گری —
- ایک بڑے مجرم کی کہانی — جس کا منصوبہ بھی بہت بڑا اور گھناؤنا تھا —
- وہ کیا چاہتا تھا — شوکی برادرز اس کے مقابلے میں تنکا تھے —
- شوکی برادرز پر کیا بیتی —

قیمت: چھے روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

انسپکٹر ارسلان سیریز ۴

سوتیلا باس

مصنف : آفتاب احمد

- ○ لیجیے — اب باس بھی سوتیلے ہونے لگے —
- ○ لیکن کیسے — یہ تو آپ ناول پڑھ کر ہی جان سکیں گے —
- ○ ایک شریف مجرم کی کہانی — جس کا گروہ بھی شریف تھا —
- ○ لیکن پھر یکایک باس اور گروہ کی کایا پلٹ گئی — اور سنگین مجرم ہونے لگے —
- ○ انسپکٹر ارسلان میدانِ عمل میں —
- ○ آفتاب کا ایک اور ہنگامہ پرور ناول —

قیمت : چھ روپے

بھیانک روپ

کا انعام

جواب یہ تھا : تاکہ یہ لوگ اُدھر جائیں اور انھیں ختم کر دیا جائے۔

○

قرعہ اندازی کے بعد انعام کے حق دار یہ پانچ قاری قرار پائے، انھیں پچاس پچاس روپے روانہ کیے جا رہے ہیں:

- ○ ملک طارق ولد ملک عبدالعزیز پیرس ہوٹل، اڈا پی ایچ ٹی، ہری پور —
- ○ رحمت حسین، مکان نمبر ۳۹، بلاک نمبر ۵، گلی نمبر ۱۵، سیکٹر ۱۱ ڈی فیکٹری ایریا، کوٹ لکھپت، لاہور —
- ○ محمد واصف رضا مکان نمبر ۶،۶،۸، محلہ بھبھرانہ، جھنگ صدر —
- ○ محمد آصف کوارٹر نمبر ۲ لطیف بسکٹ فیکٹری، شیخ حشمت روڈ سکھر (سندھ) —
- ○ عامر محمود رانا ۶۴-سی، بلاک نمبر ۲، سیکنڈ فلور، سی سی ایریا، طارق روڈ، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۷ —

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۰

سازشی مہربان

مصنف: اشتیاق احمد

- ○ ایک ایسے چالاک مجرم کی کہانی جس نے انھیں چوٹ پر چوٹ دی۔
- ○ صدرِ مملکت ہر ماہ تین دن ایک بالکل الگ تھلگ جگہ پر گزارتے تھے۔
- ○ انسپکٹر جمشید کو اس جگہ کی تلاش کیوں تھی۔
- ○ فاروق بہت بے چین تھا۔ اس نے خان رحمان کو فون کیا
- ○ خان رحمان گھر سے روانہ ہوئے، لیکن جب تجربہ گاہ پہنچے تو معاملہ ہی اُلٹ تھا۔
- ○ آخر میں انسپکٹر جمشید نے سازشی دماغ کو کیسے ناکام بنایا، حیرت سے بھرپور ایک کہانی۔

قیمت: ۶ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۴۱

کانسی کا مجسمہ

مصنف: اشتیاق احمد

- ○ اس بار آپ کی ملاقات ایک بہت چالاک مجرم سے ہو رہی ہے۔
- ○ خان رحمان ایک خط لے کر ان کے پاس آتے ہیں۔
- ○ خط ان کے سسر کی طرف سے تھا۔
- ○ خان رحمان جب انسپکٹر جمشید کے ساتھ تفتیشی مہم پر روانہ ہوئے تو کیا گزری۔
- ○ آپ یوں محسوس کریں گے جیسے ان کے جسم میں فاروق کی روح حلول کر گئی ہو۔
- ○ اور آخر میں جب مجرم آپ کے سامنے آئے گا تو آپ اچھلے بغیر نہیں رہیں گے۔

قیمت: چھے روپے

مشہور و معروف مصنف اشتیاق احمد
کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور
جاسوسی سے بھرپور ناول

اب ہر ماہ 4 نئے ناول

* اشتیاق احمد بچوں کے ادب میں ایک نئے انداز کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔
* اب تک چھوٹے بڑے 665 ناول لکھ چکے ہیں۔
* ان میں سوا سو صفحات والے ناولوں سے لے کر 2 ہزار صفحات والے ناول تک شامل ہیں۔
* اشتیاق احمد دنیا کے واحد مصنف ہیں... جنہوں نے دو ہزار صفحات کا بچوں کا ناول لکھا۔ یہ عالمی ریکارڈ ہے۔
*
665 ناولوں کا ریکارڈ بھی عالمی ہے۔ آج تک بچوں کے کسی ناول نگار کے اتنے ناول نہیں ہیں۔
* یہ سلسلہ الحمد للہ تا حال جاری ہے...

9/12 نصیر آباد۔ سانده کلاں۔ لاہور

7112969-7246356